SHAHKAR

شاہکار



26

ا
روپیہ

لانہ
ں روپے

ٹ ایس۔ ایم منظر

اردو کے معیاری رسائل کا انتخاب پیش کرنے والا ماہنامہ

شاہکار

چھبیسواں نمبر

مئی ۱۹۶۲ء

اشاعت یکم اگست سنہ ۶۲ء

مجلسِ مشاورت :

سید احتشام حسین

خواجہ احمد عباس

مہندر ناتھ

خلیل الرحمن اعظمی

مظفر شاہجہانپوری

معاونین :

فدا حسین خالد

اختر صدیقی

مدیر : محمود احمد ہنر

قیمت فی پرچہ		زر سالانہ
ایک روپیہ	دفتر شاہکار	دس روپے

کتابستان ۱۷/۱ کملا نہرو روڈ - الہ آباد

کاتب : آرٹسٹ ایس - ایم مظہر

کچھ نئی کتابیں

فروغِ اردو (جگر نمبر) پہلا حصہ		۶/۰
" دوسرا حصہ		۱/۵۰
اردو مثنویاں	ڈاکٹر گوپی چند نارنگ	۶/۰
مکاتیبِ جگر	مرتبہ تسکین	۵/۴۰
افکارِ نو	فیض الرحمٰن اعظمی	۳/۵۰
اردو غزل کے پچاس سال	عبدالاحد خاں خلیل	۷/۵۰
دیارِ سحر	علی جواد زیدی	۲/۰
افکارِ سودا	شارب ردولوی	۳/۵۰
بہارِ طفلی	تلوک چند محروم	۳/۵۰
شعلۂ نوا	"	۵/۵۰
ہندوستانی ڈرامہ	ڈاکٹر صفدر آہ	۳/۷۵
تعارفِ تاریخ اردو	شجاعت علی سندیلوی	۴/۰
کاروانِ وطن	تلوک چند محروم	۷/۵۰
نقد و انتقاد	اعجاز احمد معجز	۲/۰
رنگینیاں	شکیل بدایونی	۳/۵۰
نوائے کفر	منور لکھنوی	۲/۵۰
نقشِ بہزاد	بہزاد لکھنوی	۲/۲۵
شہرِ دل	محسن زیدی	۲/۰
اردو ڈرامہ	ڈاکٹر قمر رئیس	۴/۰
غالب کی نادر تحریریں	خلیق انجم	۴/۰

کتابستان • الہ آباد

ترتیب

تصویر — روش صدیقی

افسانے

نظمیں

محمد فاروق پرنٹر، پبلشر نے اسرار کریمی پریس الہ آباد میں چھپوا کر
کتابستان، ۱۷۔ اے کملا نہرو روڈ الہ آباد سے
شائع کیا

کرشن چندر

سرتاج

ایک روز خبر آئی کہ نجا ڈاکو مارا گیا ہے اور پولیس والے اس کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال میں لا رہے ہیں۔

نجے نے ایک عرصے سے ریاست کی سرحدی تحصیل فتح گڑھ میں بغاوت پھیلا رکھی تھی اور راجہ جی نے اس کی لوٹ مار سے تنگ آ کر اعلان کر دیا تھا کہ جو کوئی نجا کا سر کاٹ کر اُن کے دربار میں پیش کرے گا اُسے دس ہزار روپیہ نقد، خلعت اور جاگیر انعام میں دی جائیگی۔ فتح گڑھ کا سردار موسیٰ خان ایک عرصے سے نجے کی تاک میں تھا۔ اور چاروں طرف اس نے اپنے آدمی اس کام کے لئے پھیلا رکھے تھے۔ ایک روز آدھی رات کے قریب جب نجا فتح گڑھ کے قلعے کے نیچے سردار موسیٰ خاں کے گاؤں کے قریب سے گزر رہا تھا، موسیٰ خاں نے اس کی پیٹھ میں چھ گولیاں مار کر اُسے ہلاک کر دیا۔ اور اب وہ نجے کی لاش کو اٹھوا کر اپنے حمایتیوں اور شناختی گواہوں کے ہمراہ صدر مقام پر آیا تھا۔ تاکہ خلعت، جاگیر اور دس ہزار روپیہ نقد حاصل کر سکے۔

سردار موسیٰ خان اپنی کارکردگی پر بہت خوش تھا۔ کیوں کہ نجے نے جس کا اصلی نام فیض محمد خان تھا، ایک عرصے سے فتح گڑھ اور دوہالہ کے علاقے میں کھلبلی مچا رکھی تھی۔ فتحگڑھ کا علاقہ راجہ جی کی ریاست میں اور دوہالے کا علاقہ انگریزی عملداری میں شامل تھا لیکن لوگ

کہتے ہیں کہ آج سے ایک سو سال پہلے ان دونوں علاقوں پر گکھڑوں کی حکومت قائم تھی۔ جو ان علاقوں میں آباد تھے۔ لیکن اس آزاد ریاست کو ایک طرف سے انگریزوں نے اور دوسری طرف راجہ جی کے دادا نے حملہ کر کے ختم کر دیا تھا۔ گکھڑ اس دو طرفہ لڑائی کی تاب نہ لا سکے اور جرارت اور بہادری اور جی داری سے لڑنے کے باوجود ہار گئے۔ لیکن ہارنے کے باوجود یہ امر ایک حقیقت ہے کہ یہ علاقہ آج تک کبھی پوری طرح سے مطیع نہ ہو سکا۔ کیونکہ گکھڑ بڑے جنگجو، خودسر اور آزادی پسند واقع ہوئے ہیں۔ اُن کے علاقے میں آج تک ہمیشہ کبھی نہ کبھی کوئی بغاوت ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے سرکار انگلشیہ نے دوہالے کے مقام پر ایک بہت بڑی فوجی چھاؤنی قائم کی تھی اور ادھر ریاستی علاقے میں راجہ جی کی ایک تہائی فوج فتح گڑھ کے قلعے اور کوٹ بلیر خان کی گڑھیوں میں گکھڑوں کی سرکوبی کے لئے ہمیشہ موجود رہتی تھی۔

نجا اپنے علاقے کے لوگوں میں کسی طرح کی لوٹ مار نہ کرتا تھا۔ پہلے تو وہ دوہالے کے علاقے میں اپنے باغی گکھڑوں کے ہمراہ پولیس کی چوکیوں پر حملہ کرتا رہا۔ لیکن جب انگریزی پولیس نے اس کا ناطقہ بند کر دیا اور چاروں طرف اپنے مخبروں کا جال پھیلا دیا تو نجا دریائے سون کو پار کر کے ریاست کی عملداری میں داخل ہو گیا اور فتح گڑھ کے علاقے میں اپنی سرگرمیوں کو پھیلانے لگا۔ پہلے تو صرف دوہالے کے ڈپٹی کمشنر نے اس کی گرفتاری کے لئے پانچ ہزار کا انعام رکھا تھا۔ لیکن جب ریاست میں آ کر نجے نے ایک دن فتح گڑھ تحصیل کے خزانے کو دن دہاڑے لوٹ لیا تو اس واقعہ کے بعد راجہ جی بھی اُس کی جان کے دشمن ہو گئے اور انھوں نے اس کے سر کے لئے دس ہزار کا انعام رکھ دیا۔ لیکن اس انعام رکھنے کے ڈیڑھ سال بعد بھی نجا کسی کے ہاتھ نہ آیا اور بدستور اپنے دلیرانہ حملوں میں مصروف رہا۔ یوں بھی دوہالے اور فتح گڑھ کے علاقے میں کسی ڈاکو کو پکڑنا آسان نہیں ہے۔ یہ علاقہ سخت دشوار گزار، بنجر، ویران اور پُرپیچ سنگلاخ پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ جہاں ننگی چٹانوں اور سنتھے کی جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ پانی کمیاب ہے۔ بارش کم ہوتی ہے۔ صرف کہیں کہیں اکا دُکا

وادیوں میں جوار باجرے یا مکئی کی فصل ہوتی ہے۔ لوگ بے حد غریب اور جفاکش ہیں اور اپنی غریبی کے باوجود اپنے علاقے کی آزادی پر جان دیتے ہیں۔ ہر گاؤں میں پوشیدہ طور پر بندوقیں تیار ہوتی ہیں اور غیر قانونی طور پر انگریزی علاقے میں بھیجی جاتی ہیں اور یہی ان لوگوں کی سب سے بڑی تجارت ہے۔

نجا کوٹ بلیر خان کا رہنے والا تھا اور ایک لوہار کا بیٹا تھا اور بندوق کی دونالیاں بے حد عمدہ تیار کرتا تھا۔ اس کے ہات کی بنی ہوئی بندوقیں دور دور تک جاتی تھیں۔ اس تجارت کے سلسلے میں وہ ایک بار دوہالے کے قریب اپنی بندوقیں بیچتا ہوا پکڑا گیا اور تین سال کے لئے جیل میں ڈال دیا۔ مگر نجا بے حد ذہین اور سرکش طبیعت کا مالک تھا۔ ڈیڑھ سال جیل کاٹنے کے بعد انگریزی جیل سے فرار ہوگیا اور اپنے علاقے کی پہاڑیوں میں پناہ گزیں ہوکر ڈاکو بن گیا۔

شاید نجا اب تک زندہ ہوتا، اگر اسے خانم سے محبت نہ ہوگئی ہوتی۔ خانم سردار موسیٰ خان کی لڑکی تھی اور سردار موسیٰ خان فتح گڑھ کا نمبردار تھا اور اپنے علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا اور خانم اس کی اکلوتی لڑکی تھی۔ اور سنا ہے کہ اس قدر حسین تھی کہ راولپنڈی اور گوجرخان کے انگریزی علاقے تک سے اس کی شادی کے پیغام آتے تھے۔ نجا اسی خانم پر مرتا تھا۔

نجے نے خانم کو سب سے پہلے سون کے میلے میں دیکھا تھا۔ سون کا میلہ ہر سال برسات کے موسم میں دریائے سون کے کنارے ہوتا ہے۔ ایک طرف ریاستی علاقہ دوسری طرف انگریزی علاقہ۔ بیچ میں دریائے سون بہتا ہے اور یہ میلہ ہر سال اسی مزار پر ہوتا ہے اور دوہالے اور فتح گڑھ دونوں علاقوں کے گھڑ اپنی بندوقوں کو چھوڑ کر اور اپنی رقابتوں کو بھول کر اور لڑائی جھگڑوں کو بالائے طاق رکھ کر شاہ نظیر کے میلے میں شریک ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ اس میلے میں آج تک کبھی کوئی فساد نہیں ہوا۔ کبھی کوئی پولیس کا آدمی نہیں

آیا۔ یہ گکھڑوں کا قومی میلہ ہے۔ اور اس دن کے لئے دور دور سے علاقے کے گکھڑ اس مقام پر پہنچتے ہیں اور اونچ نیچ نابرابری اور ذاتی مناقشات کے تمام مسائل بھول کر یکجہتی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔

اس موقعے پر کشتیاں ہوتی ہیں۔ پنجے لڑائے جاتے ہیں۔ بینیاں پکڑی جاتی ہیں اور سب سے آخر میں تیراکی کا مقابلہ ہوتا ہے۔ کیوں کہ سون کا دریا بھی تو اپنے علاقے کے لوگوں کی طرح شوریدہ سر ہے۔ اور اس مقام پر تو وہ اور بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔ دونوں طرف اونچی اونچی ننگی چٹانوں والی گھاٹیاں کھڑی ہیں۔ جن کو کاٹتا ہوا ایک خطرناک تیزی سے دریائے سون پل کے نیچے سے گزرتا ہے، جس کی دیواریں ایک طرف تو فتح گڑھ کے قلعے سے مل جاتی ہیں۔ اور دوسری طرف انگریزی علاقے کی کسٹم کی چوکی پر ختم ہوتی ہیں۔ یہاں پر دریائے سون کی روانی سب سے تیز ہے۔ اور پھر برسات میں جب یہ میلہ ہوتا ہے اُس زمانے میں تو سون کے تنگ پاٹ کی روانی اور اس کی کف آلود لہروں کے غیض وغضب کا عالم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی ہزاروں من وزنی چٹان بھی اس پانی کے بہاؤ کے سامنے آئے گی تو گھاس کے تنکے کی طرح بہہ جائے گی۔ ان طوفانی پانیوں میں تیرنا جیتے جی موت کو دعوت دینا ہے۔ مگر گکھڑ نوجوان ہر سال خوشی خوشی اس تیراکی کے مقابلے میں شریک ہوتے ہیں۔ کئی بار کئی تیراک شوریدہ سر لہروں کی تاب نہ لا کر اُن کے تھپیڑوں سے پار نہ جا سکے اور واپس بھی نہ آسکے۔ بلکہ پانی کی لہروں میں یوں بہہ گئے کہ دوسرے دن دس میل فاصلے پر نیچے گھاٹی کے کنارے اُن کی لاش ملی۔ تو بھی نوجوانوں میں تیراکی کا یہ مقابلہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ کیونکہ اس مقابلہ میں اوّل نمبر پر آنے والے کو گکھڑ قوم کا ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ ہر سال سات نوجوانوں کی ایک ٹولی فتح گڑھ کے قلعے کی دیوار کے نیچے اُس پار جانے کے لئے کھڑی رہتی ہے اور سات نوجوانوں کی ٹولی دوہالے کے کنارے سے اِدھر آنے کے لئے کھڑی رہتی ہے

ایک اشارے پر دونوں طرف کے نوجوان پانی میں کود پڑتے ہیں اور جو نوجوان سب سے پہلے اُدھر سے اِدھر یا اِدھر سے اُدھر کے کنارے پر پہنچتا ہے اُسے چاندی کے موٹھ والا خنجر انعام میں دیا جاتا ہے۔ اور یہ رسم بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ نوجوان کنارے پر کھڑے ہوئے سر پنچ یا مقدم کے پاس جاکر اسے تعظیم دیتا ہے۔ مقدم اُسے گلے سے لگا لیتا ہے اور اس کا ماتھا چوم کر اُسے قومی خنجر پیش کرتا ہے جسے لے کر نوجوان دو قدم پیچھے ہٹتا ہے اور پھر خنجر کو اٹھا کر مقدم کو فوجی سلام کرتا ہے۔ پھر مقدم کہتا ہے۔

"بول جوان اور کیا چاہیے؟"

اس کے جواب میں جوان کہتا ہے۔ "شاہ نظیر کا سایہ اور مقدم کی دعا چاہیے"۔ اتنا کہہ کر نوجوان سر جھکا لیتا ہے۔ پھر مقدم آگے بڑھتا ہے اور وہ نوجوان کے کندھے پر ایک چادر ڈال دیتا ہے جسے نوجوان اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلا دیتا ہے۔ اس پر وہ مقدم اس پھیلی ہوئی چادر میں نقد انعام ڈال دیتا ہے جو ہمیشہ ایک سو گیارہ روپے کا ہوتا ہے۔

ہمیشہ ہر سال یوں ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح کے سوال و جواب پورے ہوتے ہیں۔ جیتنے والا مقدم کو تعظیم دیتا ہے۔ مقدم آگے بڑھ کر اُسے گلے سے لگا لیتا ہے۔ اُسے قومی خنجر دیتا ہے۔ نوجوان فوجی سلام کرتا ہے۔ مقدم پوچھتا ہے۔ بول جوان اور کیا چاہیے۔ جوان کہتا ہے شاہ نظیر کا سایہ اور مقدم کی دعا چاہیے۔ اس پر مقدم نوجوان کے گلے پر چادر ڈالتا ہے۔ نوجوان چادر کو اپنے دونوں ہاتھوں پر پھیلا کر خاموشی سے سر جھکا لیتا ہے تو مقدم اُسکی پھیلی ہوئی چادر میں ایک سو گیارہ روپے ڈال دیتا ہے۔ اور ڈھول تاشے بجنے لگتے ہیں اور گھبرو نوجوان شور مچاتے ہوئے آتے ہیں اور اپنے ہیرو کو کندھے پر اٹھا کر ناچنے لگتے ہیں۔ صدیوں سے یونہی ہو رہا ہے۔

گر جس سال نبے نے تیراکی کے مقابلے میں حصہ لیا۔ اس سال میلے سے سات دن

پہلے خلافِ معمول دن رات بارش ہوتی رہی تھی۔ اور بڑی بوڑھیوں کو بھی یاد نہ تھا کہ اس علاقے میں ایسی زور کی جھڑی اس سے پہلے کبھی ہوئی تھی۔ دریائے سون کا پانی پُل سے صرف چند گز نیچے رہ گیا تھا۔ اور چٹانوں سے اوپر قلعے کی دیواروں سے ٹکراتا تھا اور دوسری طرف شاہ نظیر کے مزار کے چبوترے تک پہنچ گیا تھا۔

اُس سال نجا انگریزی جیل سے بھاگ کر اپنے علاقے میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اب تک وہ دو چار چوکیوں پر حملہ کر چکا تھا۔ اور گکھڑ نوجوانوں میں اس کی شہرت پھیلنا شروع ہو گئی تھی۔

اُسی سال میلے میں نجے نے خانم کو دیکھا جو سردار موسیٰ خاں کی اکلوتی لڑکی تھی اور اپنے علاقے کی حسین ترین دوشیزہ سمجھی جاتی تھی۔ لمبے قد والی سیاہ آنکھوں والی دراز بالوں والی بھرپور جوانی والی خانم میلے میں جس طرف سے گزرتی تھی۔ نوجوانوں کے دل دھک سے رہ جاتے تھے اور وہ سناٹے میں آکر رہ جاتے تھے۔ ایسا باوقار مرعوب کر دینے والا حسن انھوں نے آج تک اپنے علاقے کی کسی عورت میں نہ دیکھا تھا۔ خانم کو اس میلے میں جس نے دیکھا سینے پر ہاتھ رکھ کر رہ گیا۔ نجا حالانکہ ایک خوبصورت کڑیل جوان تھا۔ قد چھ فٹ سے نکلتا ہوا۔ رنگ سانولا۔ سینہ فراخ اور جسم اس قدر مضبوط جیسے اُس کے وطن کی سانولی پہاڑیوں کی ننگی چٹان سے تراشا گیا ہو۔ مگر جونہی اس نے خانم کو دیکھا تو اس کا چہرہ ایک دم پھیلا پڑ گیا۔ اس کا سانس اس کے سینے میں اٹکنے لگا۔ خانم نے ایک سیدھی سپاٹ کھلی بے خوف نڈر نگاہ اس پر ڈالی اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ اور یکایک نجے کو ایسا محسوس ہوا جیسے سورج پہ سایہ سا آگیا ہے۔

اُسی وقت اس نے اپنے دل میں محسوس کیا کہ اُسے تیراکی کے مقابلے میں حصہ لینا چاہیے۔ حالانکہ اس میلے میں پولیس کے مخبر بہت ہوں گے۔ اور اُس کے حمایتیوں نے اُسے اس مقابلے میں حصہ لینے سے منع کیا تھا۔ اور اپنے تحفظ کی خاطر ان کی بات مان بھی

گیا تھا۔ مگر خانم کو دیکھ کر نہ جانے کیوں اُس کے دل میں تیراکی کے مقابلے میں حصہ لینے کی خواہش زور پکڑنے لگی اور جوں ہی تیراکی کے مقابلے کے لئے ڈھول بجنے لگے، وہ لنگوٹ باندھ کر میدان میں آگیا اور اُس نے اپنے دوست شاہنواز خان کو ہٹا کر اُس کی جگہ تیراکی کے مقابلے میں لے لی۔ شاہنواز نے حیرت کی نگاہ سے نجے کو دیکھا۔ مگر نجا اس کا سردار اور رہنما تھا' اس لئے شاہنواز مقابلے سے ہٹ گیا اور اُس نے اپنی جگہ نجے کو دے دی۔

لیکن پانی کی روانی اس قدر تیز تھی اور سون کا دھارا اس قدر خطرناک تھا کہ فتح گڑھ کے کنارے سے ادھر آنے والے تیراکوں میں ایک بھی ادھر تک نہ پہنچ سکا اور اُدھر سے فتح گڑھ جانے والے تیراکوں میں سے صرف دو جوان ریاستی علاقے کے کنارے تک پہنچ سکے۔ جہاں سردار موسیٰ خان مقدم کی حیثیت سے ان کی عزت افزائی کے لئے موجود تھا۔ اس کے پیچھے اس کی بیٹی خانم کھڑی تھی اور اس کے گاؤں کے لوگ۔ اور اب پل پار کر کے دوہالے کے علاقے کے لوگ بھی ڈھول بجاتے ہوئے اس رسم کو دیکھنے کیلئے آگے بڑھے۔

نجا سب سے پہلے نمبر پر آیا تھا۔ اُس کے ٹخنوں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا سینہ ایک دھونکنی کی طرح پھیل رہا تھا مگر وہ اپنے لنگوٹ کو کستا ہوا' ہنستا ہوا' اور اپنے بھیگے ہوئے چہرے کو پونچھتا ہوا سردار موسیٰ خان کے سامنے بھاگ کر چلا گیا۔ قریب جا کر اس نے تعظیم دی۔

موسیٰ خان نے اُسے اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس کے بھیگے ہوئے ماتھے کو چوما جس پر بھیگے ہوئے بالوں کی لٹیں پڑی تھیں۔ پھر اُس نے اپنی کمر سے قومی خنجر نکال کر نجے کے ہاتھ میں دیا۔ نجے نے دو قدم پیچھے ہٹ کر خنجر کو ہاتھ میں اٹھا کر اپنی دونوں ایڑیاں ملا کر مقدم کو فوجی سلام کیا۔

سردار موسیٰ نے پوچھا۔

"بول جوان کیا چاہیے؟"

"شاہ نظیر کا سایہ اور خانم کا ہات!" نجے کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اسکی سیدھی صاف نگاہ خانم پر تھی۔

خانم نے چونک کر دراز قد نجے کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر اُسکی نگاہ شرم سے جھک گئی اور اسکی زیتونی رنگت گلاب کی طرح سرخ ہوگئی۔

ایک دم سینکڑوں لوگوں کے چہرے فق ہو گئے۔ یہ کون دیدہ دلیر تھا جس نے بزرگوں کی پرانی رسم کو توڑا تھا۔ یوں ایک لمحے میں نیچ گرھ کے سب سے بڑے سردار کی بھرے میلے میں بے عزتی کر ڈالی تھی اور یوں سب کے سامنے اسکی بیٹی مانگ لی تھی۔

"نجے تیری یہ ہمت؟" سردار موسیٰ خاں غصّے سے گرجا۔ "ایک معمولی ڈاکو ہو کر ایک سرداری لڑکی پر نظر رکھتا ہے۔ بدتخم۔ بے ایمان۔ تونے بھرے میلے میں بزرگوں کی رسم کو توڑا ہے۔ آج تیری بوٹی بوٹی نوچ لی جائیگی۔"

موسیٰ خاں اور اُس کے گاؤں کے بہت سے لوگ نجے کو مارنے کے لئے آگے بڑھے۔ مگر نجا پلٹ کر دریا کیطرف بھاگنے لگا۔ اور بیشتر اسکے کہ وہ لوگ اُسے پکڑ سکتے اُس نے ایک اونچی چٹان سے کود کر پھر دریا میں چھلانگ لگا دی۔

تماشائیوں نے اپنے دل تھام لئے۔

اس بار نجا چڑھے ہوئے دریا کو چیر کر شاہ نظیر کے مزار کے چبوترے پر نہیں اُتر سکا۔ بلکہ اس سے بہت پہلے میلے کے مقام سے بہت دور نیچے کنارے پر جا لگا۔ پھر ایک چٹان پر کھڑے ہو کر اُس نے اپنی دونوں ہتھیلیوں کو پھیلا کر اپنے منہ کے دونوں طرف رکھ کر زور سے چلا کر کہا۔

"موسیٰ خان یاد رکھ تیری بیٹی اب میری ہے!"

(۲)

اب وہ مردہ تھا۔ اور اُس کی لاش پولیس والوں کی معیت میں ہسپتال آچکی تھی۔ ہسپتال میں سینکڑوں لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے آدمی ہسپتال میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ہسپتال کے اردگرد میلہ سا لگ گیا تھا۔ جوق در جوق لوگ اُس باغی کو دیکھنے کے لئے آرہے تھے جس کے سر کے لئے راجہ جی نے دس ہزار روپئے کا انعام رکھا تھا۔ انگریزی علاقے میں بھی تاریں بھیجی جاچکی تھیں اور سنا تھا کہ دوردراز کے ضلع کا انگریز ڈپٹی کمشنر خود لاش کی شناخت کے لئے آنے والا ہے۔ تب تک یہ لاش ہسپتال کے مردہ خانے میں برف میں دبا کر رکھی جائے گی۔ یہ مردہ خانہ سپیشل کوارٹروں کے نیچے کی گھاٹی پر سب سے الگ تھلگ تھا۔ اور مجھے اس جگہ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ اور میں اس طرف کبھی نہ جاتا تھا۔ اور نہ ہی میری ماں جی مجھے کبھی اس طرف جانے دیتی تھیں۔ اور مردہ خانے کے بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے سنا کر انھوں نے مجھے مردہ خانے سے اور بھی خائف کر دیا تھا۔ اور میں اپنے پتاجی کی جرات پر بہت حیران ہوا کرتا تھا کہ کس طرح وہ مردوں کی چیر پھاڑ اس دلجمعی سے کرلیتے ہیں۔ لیکن وہ زمانہ میرے بچپن کا تھا۔ لیکن اب بڑا ہو جانے پر مجھے مردوں پر کوئی حیرت نہیں ہوتی۔ مردے خوش قسمت تھے کہ وہ مر گئے۔ لیکن حیرت ان زندوں پر ہوتی ہے، جو شب و روز واقعات و حالات کا ظلم سہتے ہیں، خود اپنی آنکھوں سے اپنی زندگی کے ٹکڑے ہوتے دیکھتے ہیں اور کوئی احتجاج کئے بغیر سماج کے مردہ خانے میں پڑے پڑے سڑ جاتے ہیں!

لاش کو دیکھنے کی ہمت تو مجھ میں نہیں تھی۔ اس لئے میں ہسپتال کے برآمدے کے باہر ہی ڈرا سہما لوگوں کی باتیں سنتا رہا، جو اندر سے لاش دیکھ کر آرہے تھے اور اب ہسپتال

کے باہر باغ کی کیاریوں میں دو چار دس کی ٹولیاں بنائے باتیں کر رہے تھے۔ ایک بچے کی موجودگی کو کون اہمیت دیتا ہے۔ اس لئے وہ لوگ باتیں کرتے رہے اور میں اس ٹولی سے اس ٹولی میں جا کر اُن کی باتیں سنتا رہا۔ اور جو باتیں وہ کر رہے تھے ان سے معلوم ہوا کہ موسیٰ خان نے بڑی جی داری سے نجے کا پیچھا کیا تھا۔ اور جب نجا جان بچا کر بھاگنے لگا تو موسیٰ خان نے اُسے گولی سے ہلاک کر دیا ورنہ عین ممکن تھا کہ موسیٰ خان نجے کو زندہ ہی پکڑ کر راجہ صاحب کے حضور میں پیش کرتا۔ مگر راجہ صاحب اب بھی موسیٰ خان کے کارنامے پر بہت خوش تھے۔ تجویز یہ تھی کہ جب انگریز صاحب بہادر دو ہالے نے آکر لاش کو شناخت کریگا اور موسیٰ خان کے انعام کے کاغذ پر دستخط کر دے گا تو نجے کا سر کاٹ کر ایک نیزے پر چڑھا کر صدر مقام میں جگہ جگہ دکھایا جائے گا تاکہ بدمعاشوں اور باغیوں کو عبرت ہو۔

ہسپتال میں اس واقعے پر خود موسیٰ خان بھی اپنے تیس چالیس حمایتیوں کیساتھ موجود تھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والا ناٹے قد تانبے کے رنگ کا ہرے بدن کا ادھیڑ عمر کا آدمی تھا۔ مجھے اس کی آنکھیں بڑی خوفناک معلوم ہوتی تھیں اور اس کی ہنسی بڑی ہی کرخت اور کڑوی تھی۔ اور وہ گفتگو کرتے ہوئے اپنی کارتوسوں کی پیٹی کو ہلاتا تھا جو اس کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ مجھے موسیٰ خان سے بڑا ڈر لگا۔ اس لئے میں اُسے دور ہی سے دیکھ کر واپس پیچھے اپنے گھر کو بھاگ گیا جہاں ماں جی نے مجھے اوپر ہسپتال جانے پر ڈانٹ پلائی اور دن بھر کے لئے گھر سے نکلنے کے لئے منع کر دیا۔

جب شام گہری ہو گئی تو پتاجی ہسپتال سے تھکے ہارے لوٹے۔ مگر آج ماں جی نے انھیں بنگلے کے باہر برآمدے میں ہی روک لیا۔ یہ ماں جی کا دستور تھا کہ جس دن ہسپتال میں کوئی لاش آتی تھی۔ وہ پتاجی کو گھر میں گھسنے نہیں دیتی تھیں جب تک وہ اُن پر گنگا جل نہ چھڑک دیں۔ جو پوجا کے کمرے میں ایک بند ٹین میں مقفل رہتا تھا۔ اس لئے ماں جی نے برآمدے کے باہر ہی پتاجی کو روک دیا۔ اُن پر دور ہی سے گنگا جل چھڑکا۔ پھر اُن

سے کہا کہ وہ اپنے کپڑے اتار دیں اور ایک نئی اور کوری دھوتی انھوں نے پتاجی کو پہننے کو دی۔ اور وہ اسی دھوتی میں لپیٹے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ماں جی انھیں سیدھے غسلخانے میں لے گئیں۔ جہاں گرم پانی اُن کے نہانے کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔ نہا دھو کر نئے کپڑے پہن کر جب ڈاکٹر صاحب غسلخانے سے نکلے تو ماں جی کی جان میں جان آئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد ہم تینوں نے کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد پتاجی سیدھے سونے کے کمرے میں چلے گئے، اور دیر تک ایک بڑی کتاب اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے، اور دو تین گھنٹوں کے بعد جب رات گہری ہو چکی اور انھیں پورا یقین ہو گیا کہ میں سو گیا ہوں تو وہ ماں جی کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔

"کاکے دی ماں، سو گئی کہ جاگتی ہے؟"

"نہیں جاگتی ہوں۔" ماں جی اپنے بستر میں دبکی سہم کر بولیں۔

"تو بولتی کیوں نہیں!"

"کیا بولوں۔ مجھے تو اُس موئے ڈاکو سے ڈر لگتا ہے جو مردہ خانے میں پڑا ہے۔"

"وہ ڈاکو نہیں تھا۔"

"ڈاکو نہیں تھا تو پھر کون تھا؟" ماں جی نے حیرت سے پوچھا۔

پتاجی آہستہ سے بولے۔ "وہ تیری میری طرح کا ایک انسان تھا۔ جو اپنے لوگوں کی بھلائی کے لئے کام کرتا تھا۔"

"پرے ہٹو" ماں جی تنک کر بولیں۔

"تم بھی جانے کیسی اُلٹی پلٹی باتیں کرتے ہو۔ ساری دنیا جانتی ہے۔ نجا ایک ظالم ڈاکو تھا۔ جس کے سر پر راجہ جی نے انعام رکھا تھا۔ کیوں کہ اس نے سارے علاقے میں اودھم مچا رکھا تھا۔ وہ تو پرماتما بھلا کرے عیسیٰ خان کا جس نے اُس ظالم کو گولی سے مار دیا۔"

"عیسیٰ خان نہیں موسیٰ خان" پتاجی نے کہا۔

"ایک ہی بات ہے۔ ان سب موئے مسلمانوں کے نام ایک جیسے ہوتے ہیں۔ مجھے نہیں آتا۔۔۔۔" ماں جی نے ہات چلاکر بڑی نخوت سے کہا۔

"اور ہندوؤں کے نام ایک سے نہیں ہوتے کیا؟" پتاجی مسکراکر بولے۔ "اندر۔ بیرندر۔ مہندر۔ راجندر۔ گجندر۔ سبھی اندر ہی اندر ہیں!"

"تم جب بات کرنے بیٹھتے ہو۔ مسلمانوں کی طرف داری کرنے لگتے ہو۔ اب نجا ڈاکو ڈاکو ہی نہیں ہے۔ کل کہو گے عیسیٰ خان نے نجے کو مارا ہی نہیں۔"

"عیسیٰ خان نہیں موسیٰ خان" پتاجی نے پھر بتایا۔

"اچھا بابا موسیٰ خان ہی سہی۔ پھر؟"

"پھر قصہ یہ ہے کہ موسیٰ خان نے نجے کو لڑائی میں نہیں مارا" ڈاکٹر صاحب بولے۔

"وہی بات! میں نہ کہتی تھی کہ تم آجاؤ گے اپنی الٹی سیدھی تھیوری پر۔" ماں جی ذرا غصے سے بولیں۔

"لوگ کہتے ہیں نجے کو موسیٰ خان کی لڑکی خانم سے محبت تھی۔ اور خانم بھی اس جیالے نوجوان سے پیار کرنے لگی تھی۔ مگر چونکہ موسیٰ خاں نجے کے خلاف تھا۔ اور نجے کے خلاف ریاستی اور انگریزی دونوں علاقے کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے۔ اس لئے نجا خانم سے چوری چھپے ملتا تھا۔ وہ دن بھر پہاڑیوں کی غاروں اور کھاروں میں چھپا رہتا تھا اور دور دراز کے تھانوں پر ڈاکے مارتا۔ پولیس اور فوج کو عاجز کرتا اور پھر ایک چھلاوے کیطرح غائب ہو جاتا۔ سارے علاقے کے نوجوان در پردہ اُس کے حمایتی تھے۔ نوجوان لڑکیوں نے اس کی تعریف میں گیت کہے تھے۔ اور وہ اپنے علاقے کا بہت بڑا ہیرو تھا۔ اور خانم جی جان سے اُس سے پیار کرتی تھی۔ گہری اندھیری راتوں میں سون دریا کے کنارے فتح گڑھ کے قلعے کی دیواروں کے نیچے خانم اور نجا ملا کرتے تھے۔ چند گھنٹوں کے لئے پھر نکی فجر سے پہلے نجا یا تو فتحگڈھ

کی سنگلاخ پہاڑیوں کی راہ لیتا یا دریا پار کر کے دوہابے کے علاقے میں چلا جاتا۔ اور اسے آج تک کوئی نہ پکڑ سکا تھا۔"

"پھر وہ کیسے پکڑا گیا؟" ماں جی نے پوچھا۔

"خانم کی ایک خالہ نے، جو اب تک اس کی ہمراز رہی تھی، ایک روز سوہنی خاں کو یہ سب کچھ بتا دیا۔"

"ہائے ری جنم جلی ستھاڑی بڈھی خالہ تجھ کو شرم نہ آئی۔" ماں جی کو ایک دم خانم اور نجے پر ترس آ گیا۔ "نی خصماں کھانیے۔" ماں جی نے گویا اس خالہ کو اسی لمحے مخاطب ہو کر کہا۔ "تجھے ان غریبوں کا پیار برباد کرتے ہوئے لج نہ آئی۔"

پھر وہ پتا جی کی طرف مڑ کر بولیں۔ "پھر کیا ہوا؟"

"پھر یہ ہوا کہ یہ خبر سنتے ہی سوہنی خاں نے نجے کو پکڑنے کے لئے گاؤں کے چاروں طرف اپنا جال پھیلا دیا لیکن اس نے تھانے کے نوجیوں کو مطلق خبر نہ دی۔ مبادا وہ بھی انعام کے حقدار بن جائیں۔ ہر روز رات کو اس کے لوگ پہرہ دیتے تھے۔ اور صرف اس ٹوہ میں رہتے تھے کہ رات کو کہیں خانم باہر جائے تو وہ اس کا پیچھا کریں۔"

"پھر؟" ماں جی کی سانس تیز ہو گئی۔

"پہلے تین روز تو کچھ نہ ہوا۔ خانم بڑے مزے سے اپنے گھر میں سوتی رہی۔ چوتھی رات کو جب آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر ہوئی تو خانم اٹھ کر بیٹھ گئی اور خالہ کو بھی اس نے جگا دیا۔ پھر خانم نے بال سنوارے۔ نئے کپڑے پہنے۔ نیلی سوسی کی کھلی شلوار اور قمیص اور سر پر ریشمی اوڑھنی ڈال کر اپنے محبوب سے ملنے چلی!"

"ہا!" ماں جی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"خالہ ساتھ میں تھی؟" پتا جی نے بتایا۔

"کٹنی۔ مردار۔ کیڑے پڑیں اس کی جون میں۔" ماں جی نے غصے سے لرزتی ہوئی

آواز میں کہا۔

قلعہ کی دیواروں کے نیچے وہ دونوں ملے۔ خانم اور نجا۔ دونوں مل کر دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آخر جب رات کا تیسرا پہر جانے لگا تو نجا بادلِ نخواستہ خانم سے الگ ہوا۔ اور گاؤں کی چوحدی سے باہر باہر اُس راستے پر چلنے لگا۔ جو فتح گڑھ کے پہاڑی درّے کو جاتا ہے۔ جہاں اُس نے اپنا خفیہ اڈّہ بنا رکھا تھا۔ ادھر نیچے کے راستے سے نجا جا رہا تھا اُدھر اوپر کے راستے سے خانم خالہ کو لے کر اپنے گاؤں کو جا رہی تھی۔ دونوں راستوں پر تاریک سے سائے ملتے تھے اور نجا کبھی خانم کے سائے کو دیکھ کر خوش ہو لیتا۔ کبھی خانم نیچے جاتے ہوئے نجے کو دیکھ کر دل ہی دل میں واری نیاری ہونے لگتی۔"

"پھر؟"

"پھر جب نجا دریا کے کنارے ایک تنگ موڑ سے گزر کر درّے کی جانب مڑنے لگا تو کسی نے پیچھے سے چٹانوں کے عقب سے اس پر گولیوں کی بارش کر دی۔ ایک ساتھ تڑاتڑ کی آواز سے چھ گولیاں اُسکی پیٹھ میں پیوست ہو گئیں۔"

نجا زور سے چلّایا "خانم" اور اوپر کے راستے پر جاتی ہوئی خانم گولیوں کی آواز سن کر کانپ گئی اور دوڑتی گرتی پڑتی گھاٹیوں سے نیچے اتری۔ اُس موڑ پر پہنچ گئی جہاں خاک و خون میں لت پت اُس کا محبوب پڑا تھا۔ بے جان، مردہ اور اُس کی لاش پر اس کا باپ موسیٰ خان اپنے ہات میں ریوالور لئے مسکرا رہا تھا۔"

ماں جی کچھ دیر ساکت رہیں۔ خاموشی سے اپنی بھیگی پلکیں پونچھتی رہیں۔ پھر بولیں: "تم تو ایسے بات کرتے ہو جیسے تم اس موقعے پر موجود تھے۔"

"میں تو نہیں تھا۔" ڈاکٹر صاحب بولے "مگر جو تھا اُس نے مجھے خود یہ واقعہ سُنایا ہے۔"

"کس نے؟"

"خانم نے!"

"خانم یہاں آئی ہے۔" ماں جی نے حیرت سے پوچھا "یہاں؟ صدر مقام پر؟"

"ہاں! وہ اس وقت باہر برآمدے میں بیٹھی ہے۔" پتا جی نے سرگوشی میں کہا۔

ماں جی ایکدم چونک گئیں۔ دیر تک چپ رہیں۔ پھر آہستہ سے بولیں۔

"وہ یہاں کیوں آئی ہے۔ تمھارے بنگلے پر؟ وہ کیا چاہتی ہے؟"

"وہ چاہتی ہے کہ ایک دفعہ نجے کو دیکھ لے!"

ماں جی پھر دیر تک چپ رہیں۔ پھر بولیں۔"اس کے باپ کو معلوم ہے کہ وہ یہاں آئی ہے!"

"نہیں۔ وہ سب سے چھپ کر یہاں آئی ہے اور چاہتی ہے کہ میں ایک دفعہ اُسے نجے کی لاش دکھا دوں۔"

"مگر نجے کی لاش تو مردہ خانے میں ہے!"

"ہاں۔ مگر مردہ خانے کی کنجی تو میرے پاس ہے۔"

ماں جی خوف سے لرز کر بولیں۔" اس وقت آدھی رات میں تم مردہ خانے کے اندر جاؤ گے؟"

"کیا حرج ہے؟"

"اور اگر کسی کو پتہ چل گیا۔ اگر کسی نے رپورٹ کر دی۔ اگر کوئی شکایت راجہ جی تک پہنچ گئی؟"

"اس اندھیرے میں کون دیکھتا ہے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ میں تمھیں اس اندھیرے میں نہیں جانے دوں گی۔" ماں جی ایکدم فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔

"تم تو باؤلے ہو اور عقل نام کی کوئی چیز تمھارے دماغ میں نہیں ہے! میں خود

ابھی باہر جاتی ہوں اور اُس خانم سے بات کرتی ہوں"۔ ماں جی بستر سے اُٹھتے ہوئے بولیں۔

"ایسا مت کرو۔ ایسا مت کرو" پتا جی ایکدم گھبرا کر بولے۔ "اُس کا دل مت توڑو ذرا سی تو بات ہے!"

"واہ! چاہے ہماری نوکری چلی جائے۔ خوب۔ یہ بھی کیا تماشہ ہے۔ مرنے والا تو مر گیا۔ ساتھ میں ہمارا رزق بھی کیا لے جائے گا۔"

ماں جی ایک دم کمرے سے باہر نکل گئیں۔ پتا جی اُن کے پیچھے بھاگے۔ اور اُن دونوں کے پیچھے دبے پاؤں میں بھی باہر نکلا۔ مگر برآمدے میں نہیں گیا۔ دروازے کی آڑ سے دیکھنے لگا۔ برآمدے کے ایک چوبی ستون سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دو ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی اس کے مضمحل اور اداس چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ماں جی کو دیکھ کر جب وہ لڑکی اٹھی تو مجھے وہ ماں جی سے بھی لمبی معلوم ہوئی۔ اس کے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے۔ اور گھٹنوں تک آتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے لمبے بال کسی عورت کے نہیں دیکھے۔ اس کا چہرہ سپید تھا۔ اور آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور وہ بالکل چپ تھی۔ ماں جی کو دیکھ کر بھی وہ بالکل چپ کھڑی تھی۔

"چلی جاؤ!" ماں نے گرجکر کہا۔

"نہیں نہیں لاکے دی ماں!" پتا جی نے پریشان ہو کر کہا۔ مگر ماں جی تڑپ کر بولیں "تم چپ رہو" پھر خانم کی طرف مڑکر ایک انگلی اُٹھا کر بولیں۔ "سیدھے سیدھے یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ ابھی پولیس کو بلاتی ہوں"

"بس ایکبار مجھے دیکھ لینے دو" خانم آہستہ سے بولی۔

"اب اُسے دیکھ کر کیا کرو گی؟" ماں جی نے پوچھا۔

"میں اُس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں!" خانم نے بڑی سادگی سے کہا۔

"پگلی ہوئی ہو! مُردے سے کون باتیں کر سکتا ہے؟"

"میں کروں گی!" خانم نے کامل یقین سے کہا۔ "مجھے اُسے ایک بار دکھا دو صرف ایکبار۔"
ماں جی مرتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں: "جا ابھاگن چلی جا۔ مردے اگر کسی کی بات سُن سکتے تو آج کوئی عورت بیوہ نہ ہوتی۔ کسی کا بچہ یتیم نہ ہوتا۔ مگر مردے سُن نہیں سکتے!"

خانم دیر تک میری ماں کو دیکھتی رہی۔ اُس کی نگاہ کبھی میری ماں پر جاتی کبھی ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر۔ آخر وہ آزردہ خاطر ہو کر بولی: "ٹھیک ہے مردے نہیں سُن سکتے۔ شاید اس لئے تم بھی نہیں سنتی ہو۔ ڈاکٹر بھی نہیں سنتا ہے۔ اس جگہ پر کوئی بھی کسی کی نہیں سنتا ہے۔ کیا یہاں سب مردے بستے ہیں؟"

خانم نے حقارت سے پوچھا۔ اور اسکی گہری سیاہ آنکھوں میں سے شعلے لپکنے لگے۔ پھر منہ موڑ کر مزید بات چیت کئے بغیر برآمدے سے باہر نکل گئی۔

(۳)

دوسرے دن خانم نے مجسٹریٹ لال خان کی عدالت میں درخواست دی کہ وہ نجے کی بیوہ ہے۔ اس لئے نجے کی لاش اس کے حوالے کی جائے۔ درخواست لے کر جب وہ خود عدالت میں پیش ہوگئی تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ اور عدالت کو اپنا کمرہ تماشائیوں سے خالی کرانا پڑا۔ پھر بھی علاقے کے تمام بڑے بڑے افسر اور چودھری اور معزز لوگ عدالت میں موجود تھے۔ سردار موسیٰ خان بھی موجود تھا۔ مجسٹریٹ لال خان نے درخواست لیکر پوچھا "فیض محمد تیرا کیا لگتا ہے؟"

"وہ میرے سر کا سائیں (سرتاج) تھا" خانم نے بڑی بےخوفی سے جواب دیا۔

"کیا تیری اُسکی شادی ہوئی تھی؟" مجسٹریٹ نے پھر پوچھا۔

"نہیں!" خانم بولی۔

ابھی باہر جاتی ہوں اور اُس خانم سے بات کرتی ہوں"۔ ماں جی بستر سے اُٹھتے ہوئے بولیں۔

"ایسا مت کرو۔ ایسا مت کرو"۔ پتاجی ایکدم گھبرا کر بولے:"اُس کا دل مت توڑو۔ ذرا سی تو بات ہے!"

"واہ! چاہے ہماری نوکری چلی جائے۔ خوب۔ یہ بھی کیا تماشہ ہے۔ مرنے والا تو مرگیا۔ ساتھ میں ہمارا رزق بھی کیا لے جائے گا۔"

ماں جی ایک دم کمرے سے باہر نکل گئیں۔ پتاجی اُن کے پیچھے بھاگے۔ اور اُن دونوں کے پیچھے دبے پاؤں میں بھی باہر نکلا۔ مگر برآمدے میں نہیں گیا۔ دروازے کی آڑ سے کر دیکھنے لگا۔ برآمدے کے ایک چوبی ستون سے ٹیک لگائے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ دو ستونوں کے درمیان لٹکی ہوئی لالٹین کی روشنی اس کے مضمحل اور اداس چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ماں جی کو دیکھ کر جب وہ لڑکی اٹھی تو مجھے وہ ماں جی سے بھی لمبی معلوم ہوئی۔ اس کے سیاہ بال کھلے ہوئے تھے۔ اور گھٹنوں تک آتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنے لمبے بال کسی عورت کے نہیں دیکھے۔ اس کا چہرہ سپید تھا۔ اور آنکھیں گہری سیاہ تھیں اور وہ بالکل چپ تھی۔ ماں جی کو دیکھ کر بھی وہ بالکل چپ کھڑی تھی۔

"چلی جاؤ!" ماں نے گرج کر کہا۔

"نہیں نہیں، کاکے دی ماں!" پتاجی نے پریشان ہو کر کہا۔ مگر ماں جی تڑپ کر بولیں"تم چپ رہو" پھر خانم کی طرف مڑ کر ایک انگلی اُٹھا کر بولیں:"سیدھے سیدھے یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ ابھی پولیس کو بلاتی ہوں"

"بس ایکبار مجھے دیکھ لینے دو"۔ خانم آہستہ سے بولی۔

"اب اُسے دیکھ کر کیا کرو گی؟" ماں جی نے پوچھا۔

"میں اُس سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں!" خانم نے بڑی سادگی سے کہا۔

"پگلی ہوئی ہو! مردے سے کون باتیں کر سکتا ہے؟"

"میں کروں گی!" خانم نے کامل یقین سے کہا۔ "مجھے اُسے ایک بار دکھا دو صرف ایکبار۔"
ماں جی مڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں بولیں۔ "جا ابھاگن چلی جا۔ مردے اگر کسی کی بات سُن سکتے تو آج کوئی عورت بیوہ نہ ہوتی۔ کسی کا بچہ یتیم نہ ہوتا۔ مگر مردے سُن نہیں سکتے!"

خانم دیر تک میری ماں کو دیکھتی رہی۔ اُس کی نگاہ کبھی میری ماں پر جاتی کبھی ڈاکٹر صاحب کے چہرے پر۔ آخر وہ آزردہ خاطر ہو کر بولی: "ٹھیک ہے مردے نہیں سُن سکتے۔ شاید اس لئے تم بھی نہیں سنتی ہو۔ ڈاکٹر بھی نہیں سنتا ہے۔ اس جگہ پر کوئی بھی کسی کی نہیں سنتا ہے۔ کیا یہاں سب مردے بستے ہیں؟"

خانم نے حقارت سے پوچھا۔ اور اسکی گہری سیاہ آنکھوں میں سے شعلے لپکنے لگے۔ پھر منہ موڑ کر مزید بات چیت کئے بغیر برآمدے سے باہر نکل گئی۔

(۳)

دوسرے دن خانم نے مجسٹریٹ لال خان کی عدالت میں درخواست دی کہ وہ نجے کی بیوہ ہے۔ اس لئے نجے کی لاش اس کے حوالے کی جائے۔ درخواست لے کر جب وہ خود عدالت میں پیش ہوگئی تو لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے۔ اور عدالت کو اپنا کمرہ تماشائیوں سے خالی کرانا پڑا۔ پھر بھی علاقے کے تمام بڑے بڑے افسر اور چودھری اور معزز لوگ عدالت میں موجود تھے۔ سردار موسیٰ خان بھی موجود تھا۔ مجسٹریٹ لال خان نے درخواست لیکر پوچھا "فیض محمد تیرا کیا لگتا ہے؟"

"وہ میرے سر کا سائیں (سرتاج) تھا!" خانم نے بڑی نڈری سے جواب دیا۔

"کیا تیری اسکی شادی ہوئی تھی؟" مجسٹریٹ نے پھر پوچھا۔

"نہیں!" خانم بولی۔

"پھر کیا تیری اسکی آشنائی تھی؟"

"نہیں!" خانم غصّے سے بھڑک کر بولی: "میں تو کنواری ہوں۔ اُس نے تو آج تک میرے جسم کو چھوا تک نہیں! مگر پھر بھی وہ میرے سر کا سائیں تھا۔ اسکی لاش میرے حوالے کر دی جائے!"

موسیٰ نے آگے بڑھ کر ہات جوڑ کر کہا: "سرکار۔ یہ میری لڑکی ہے۔ میری اجازت کے بغیر گھر سے بھاگ کر یہاں آئی ہے۔ اُسے میرے حوالے کر دیا جائے!"

"میں کسی غدار کی لڑکی نہیں ہوں" خانم نے گرجکر کہا: "میں مجے کی بیوہ ہوں۔ اسکی لاش میرے حوالے کر دیجائے!"

مجسٹریٹ لال خاں نے خانم کو سمجھاتے ہوئے کہا: "خانم! تو ایک معزز سردار اور نمبردار کی لڑکی ہے۔ تیرے باپ نے ریاست کے ایک خطرناک باغی کو جس کے سر پر دس ہزار کا انعام تھا، مار کر ہم سب کی خوشنودی حاصل کی ہے۔ تیرے باپ کو انگریزی سرکار سے پانچ ہزار کا انعام ملے گا۔ راجہ صاحب سے دس ہزار کا انعام، خلعت اور جاگیر ملے گی۔ ایسے بڑے آدمی کی بیٹی کو ایسی باتیں نہ کہنی چاہئیں!"

خانم نے آہستہ سے مگر گہرے یقین کے ساتھ کہا: "آج بھری عدالت میں سب سے کہتی ہوں۔ میرا باپ بھی میرے سامنے کھڑا ہے۔ وہ بھی سُن لے۔ جس انعام کی خاطر میرے باپ نے یہ کام کیا ہے وہ انعام اُس کو کبھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ غدار کو کبھی انعام نہیں دیا جاتا اُسے تو سزا دی جاتی ہے۔ بس! عدالت میری درخواست کا فیصلہ کرے!"

"نامنظور!" مجسٹریٹ لال خاں نے بآوازِ بلند کہا۔

(۴)

عدالت سے نکل کر خانم اس طرح بھاگی کہ اس کا کہیں بھی پتہ نہ چل سکا۔ موسیٰ خاں نے اپنی لڑکی کی تلاش میں چاروں طرف آدمی دوڑائے۔ پولیس نے بھی بڑی دوڑ دھوپ کی۔ مگر

خانم ڈھکّی کے نیچے پہنچ کر ایسی غائب ہوئی کہ پھر اس کا پتہ نہ چل سکا۔ خانم کے دھمکی دینے اور دھمکی دے کر اس طرح غائب ہو جانے پر لوگ طرح طرح کی چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ کوئی کہتا موسیٰ خان کی زندگی خطرے میں ہے۔ اس کی لڑکی اسے قتل کر دے گی۔ موسیٰ خان حالانکہ ہر وقت ریوالور اپنی کمر میں رکھتا تھا۔ پھر بھی اس کی حفاظت کے لئے دو پولیس کے سپاہی ہر وقت اس کے ساتھ لگا دئے گئے۔ راجہ صاحب نے موسیٰ خان کو بلا کر اس کی پیٹھ ٹھونکی اور اس سے وعدہ کر لیا کہ جونہی انگریز ڈپٹی کمشنر دورہ سے آ کر اپنی شناخت مکمل کر کے موسیٰ کے انعام کے لئے حکم جاری کرے گا راجہ صاحب اس کے دوسرے دن ہی ایک دربار منعقد کر کے موسیٰ خان کو اپنے ہاتھ سے دس ہزار کی تھیلی دیں گے خلعت اور جاگیر عطا کریں گے۔ موسیٰ خان یہ انٹرویو لے کر بیحد خوش خوش اپنی قیام گاہ پر واپس آیا۔

دو دن کے بعد جب انگریز ڈپٹی کمشنر ریاست کے صدر مقام پر پہنچا اور لاش دیکھنے کے لئے ہسپتال پہنچا تو ایک عجیب واردات ہوئی۔ موقع پر پہنچ کر سب نے دیکھا کہ مردے خانے کا قفل ٹوٹا پڑا ہے۔ اور بجے کا سر غائب ہے۔ صرف ایک بے دھڑ لاش ایسی مخدوش حالت میں پڑی ہے کہ کسی طرح بھی پہچانی نہیں جاتی۔

جس سر پر دس ہزار روپے کا انعام تھا۔ وہ سر ہی غائب تھا! اس بے دھڑ لاش کو دیکھ کر انگریز ڈپٹی کمشنر نے شناختی کاغذوں پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اور جب ڈپٹی کمشنر نے انکار کر دیا تو دیسی راجہ کی کیا مجال تھی کہ موسیٰ خان کو انعام دیتا۔ نتیجے میں موسیٰ خان کو بے نیل و مرام اپنے علاقے کو لوٹ جانا پڑا۔ جہاں چند روز کے بعد اس کی لاش قلعہ کی دیواروں کے نیچے پائی گئی۔

(۵)

جس دن قفل ٹوٹا اور بجے کا سر غائب ہوا۔ اس دن شام کے وقت جب پتا جی گھر لوٹے تو بیحد خوش مسکراتے ہوئے اور گنگناتے ہوئے "بھٹی جب کان اس بن میں" کا

نغمہ اُنکے لبوں پر موجود تھا۔
"قفل کس نے توڑا؟"
"پھُٹی جب کان اس بن میں:" پتا جی جواب میں گنگناتے رہے۔
"میں کہتی ہوں ایک دن تم جیل میں جاؤگے"
"پھٹی جب کان ...."
"اور میں بازار میں بیٹھی بھیک مانگوں گی اور تمہارا بچہ؟"
"اس بن میں! اس بن میں!! اس بن میں!!!" پتاجی زور سے گانے لگے۔
پھر کچھ دیر کے بعد کھانے کے کمرے میں میری ماں سے کہنے لگے۔
"کاکے دی ماں. جانتی ہو اس دنیا میں سب سے قیمتی شے کونسی ہے؟"
"سونا؟" میری ماں نے کہا۔
"نہیں آزادی! —— کاکے دی ماں۔ اس دنیا میں سب سے مہنگی اور سب سے قیمتی چیز آزادی ہے اور تاریخ بتاتی ہے کہ انسان نے ہر موڑ پر اسکی پوری قیمت ادا کی ہے!"

عصمت چغتائی

ہندوستان چھوڑ دو

"صاحب مرگیا" جینت رام نے بازار سے سودے کے ساتھ یہ خبر لا کر دی۔

"صاحب! کون سا صاحب؟"

"وہ کانڑیا صاحب تھا نا۔"

"اوہ، کانا صاحب۔ جیکسن۔ چہ بیچارہ۔" میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر پار دیکھا۔ کائی لگی پرانی جگہ جگہ سے کھونڈی بتیسی کی طرح منہدم ہوتی ہوئی دیوار کے اس پار اُدھڑے ہوئے سیمنٹ کے چبوترے پر سکھو بائی پیر پسارے بیٹھی مراہٹی زبان میں بین کر رہی تھی۔ اسکے پاس بجو اکڑوں بیٹھا ہچکیوں سے رو رہا تھا۔ بجو یعنی پٹر کلے گورلے میل کا نادر نمونہ تھا۔ اس کی آنکھیں جیکسن صاحب کی طرح نیلی اور بال بھورے تھے۔ رنگ گندمی تھا جو دھوپ میں چل کر بالکل تانبے جیسا ہو گیا تھا۔

اسی کھڑکی میں سے میں برسوں سے اس عجیب و غریب خاندان کو دیکھتی آئی ہوں۔ یہیں بیٹھ کر میری اور جیکسن سے پہلی مرتبہ بات چیت شروع ہوئی تھی۔ سن بیالیس کا "ہندوستان چھوڑ دو" کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ گرانٹ روڈ سے دادر تک کا سفر ملک کی بے چینی کا ایک مختصر مگر جاندار نمونہ ثابت ہوا تھا۔ ولنگٹن روڈ کے ناکے پر ایک بڑا سا الاؤ جل رہا تھا جس میں راہ چلتوں کی ٹائیاں، ہیٹ اور کبھی موڈ آ جاتا تو پتلونیں اُتار کر جلائی جا رہی تھیں۔ سین کچھ بچکانا سہی مگر دلچسپ تھا۔ چھپے دار ٹائیاں نئے طرح دار ہیٹ، استری

کی ہوئی پتلونیں بڑی بیدردی سے آگ میں جھونکی جارہی تھیں۔ پھٹے چیتھڑے پہنے آشنا نئے نئے کپڑوں کو نہایت بے تکلفی سے آگ میں جھونک رہے تھے۔ ایک لمحے کو بھی کسی کے دل میں یہ خیال نہیں آرہا تھا کہ نئی گیبرڈین کی پتلون کو آگ کے منہ میں جھونکنے کے بجائے اپنی ننگی سیاہ ٹانگوں پر ہی چڑھالے۔

اتنے میں ملٹری ٹرک آگئی تھی جس میں سے لال بھبھوکا تھوتھنوں والے گورے ہاتھوں میں شین گنیں .... لئے دھادھم کودنے لگے۔ مجمع ایک دم پھر سے نہ جانے کہاں اُڑ گیا تھا۔ میں نے یہ تماشہ میونسپل دفتر کے محفوظ احاطے سے دیکھا تھا اور شین گنیں دیکھ کر میں جلدی سے اپنے دفتر میں گھس گئی تھی۔

ریل کے ڈبوں میں بھی افراتفری مچی ہوئی تھی۔ بمبئی سنٹرل سے جب ریل چلی تھی تو ڈبہ کی آٹھ سیٹوں میں سے صرف تین سلامت تھیں۔ دادر پر ریل تک وہ تینوں بھی اکھڑ کر کھڑکیوں سے باہر پھینک دی گئیں اور میں راستہ بھر کھڑی دادر آئی۔ مجھے ان چھوکروں پر قطعی کوئی غصہ نہیں آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا یہ ریلیں، یہ ٹاپیاں، پتلونیں ہماری نہیں دشمن کی ہیں۔ انکے ساتھ ہم دشمن کو بھی بھون رہے ہیں۔ اُٹھاکر پھینک رہے ہیں۔ میرے گھر کے قریب ہی سڑک کے بیچوں بیچ ٹریفک روکنے کے لئے ایک پیڑ کا لمبا سا گدّا سڑک پر لمبا ڈال کر اس پر کوڑے کرکٹ کی اچھی خاصی دیوار کھڑی کردی گئی تھی۔ میں بمشکل اسے پھلانگ کر اپنے فلیٹ کے دروازے تک پہنچی ہی تھی کہ ملٹری ٹرک آگئی۔ اور جو پہلا گورا شین گن لئے دھم سے کودا تھا جیکسن صاحب ہی تھا ٹرک کی آمد کی خبر سنتے ہی سڑک پر روک باندھنے والا دستہ اِدھر اُدھر بلڈنگوں میں سٹک گیا تھا۔

میرا فلیٹ چونکہ سب سے نچلی منزل پر تھا لہذا بہت سے چھوکرے ایکدم ریلا کرکے گھس آئے۔ کچھ باورچی خانہ میں گھس گئے کچھ غسلخانہ اور سنڈاس میں دبک گئے۔

چونکہ میرا دروازہ کھلا تھا اس لئے جیکسن معہ دو مسلح گوروں کے مجھ سے ہی جواب طلب کرنے آگے آیا۔

"تمھارے گھر میں بدمعاش چھپے ہیں انھیں ہمارے سپرد کرو۔"

"میرے گھر میں تو کوئی نہیں صرف میرے نوکر ہیں۔" میں نے بڑی لاپروائی سے کہا۔

"کون ہیں تمھارے نوکر؟"

"یہ تینوں" میں نے تین آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جو برتن کھڑبڑ کر رہے تھے۔

"غسل خانہ میں کون ہے؟"

"میری ساس نہا رہی ہیں۔" میری ساس نہ جانے اس وقت کہاں ہونگی۔

"اور پاخانے میں؟" اُس کے چہرہ پر کچھ شرارت کی جھلکی آئی۔

"میری ماں ہونگی یا شاید میری بہن ہو۔ مجھے کیا پتہ میں تو ابھی باہر سے آئی ہوں۔"

"پھر تمہیں کیسے معلوم ہوا غسل خانہ میں تمھاری ساس ہے؟"

"میں داخل ہوئی تو اُنھوں نے آواز دے کر مجھ سے تولیا مانگا تھا۔"

"ہوں۔ اچھا اپنی ساس سے کہدو کہ سڑک روکنا جرم ہے!" اس نے دبی آواز میں کہا اور اپنے ساتھیوں کو جنھیں وہ باہر کھڑا کر آیا تھا واپس ٹرک پر جانے کو کہا۔

"ہوں۔! ہوں ہوں۔" وہ گردن ہلا کر مسکراتا ہوا چلا گیا۔ اس کی آنکھوں میں پُرمعنی جگنو چمک رہے تھے۔

جیکسن کا بنگلہ میرے احاطے سے ملحقہ زمین پر تھا۔ مغربی رخ پر سمندر تھا۔ اس کی میم صاحب مع دو بچوں کے ان دنوں ہندوستان آئی ہوئی تھی۔ بڑی لڑکی جوان تھی اور چھوٹی بارہ تیرہ برس کی۔ میم صاحب صرف چھٹیوں میں تھوڑے دنوں کے لئے ہندوستان آجاتی تھی۔ اس کے آتے ہی بنگلہ کا حلیہ بدل جایا کرتا تھا۔ نوکر چاق چوبند ہوجاتے۔ اندر باہر تپائی ہوتی، باغ میں نئے گملے مہیا کئے جاتے جو میم صاحب کے جاتے ہی پاس پڑوس کے لوگ چُرانا شروع کردیتے۔ کچھ مالی بیچ ڈالتا اور دوبارہ جب میم صاحب کی آمد کا غلغلہ مچتا تو صاحب پھر وکٹوریہ گارڈن سے گملے اُٹھوا لاتا۔

جتنے دن میم صاحب رہتی نوکر باوردی نظر آتے۔ صاحب بھی یونیفارم ڈاٹے رہتا یا نہایت عمدہ ڈریسنگ گاؤن پہنے صاف ستھرے کتوں کے ساتھ پھولوں کا اس طرح معائنہ کرتا پھرتا گویا وہ سو فیصد صاحب لوگوں میں سے ہے۔

مگر میم صاحب کے جاتے ہی وہ اطمینان کی سانس لے کر دفن جاتا۔ ڈیوٹی کے بعد نیکر اور بنیان پہنے چبوترے پر کرسی ڈالے بیئر پیا کرتا۔ اور شاید اسکاڈریسنگ گاؤن اسکایرا چرا لے جاتا۔ کتے تو میم صاحب کے ساتھ ہی چلے جاتے۔ دو چار بیڑی کتے بنگلہ کو یتیم سمجھ کر احاطے میں ڈیرا ڈال دیتے۔

میم صاحب جتنے دن رہتی ڈنر پارٹیوں کا زور رہتا۔ اور وہ صبح ہی صبح نیم سردی میں اپنی آیا کو آواز دیتی۔

"آیوٗ۔ دو دا!"

"جی میم صاحب!" آیا اس کی آواز پر تڑپ کر دوڑتی۔ مگر جب میم صاحب چلی جاتی تو لوگوں کا کہنا تھا کہ آیا بیگم بن بیٹھتی تھی۔ وہ اس کی غیر حاضری میں عیوضی بھگتایا کرتی تھی۔ فلو مینا اور پٹو اسی عارضی راج کے مستقل ثبوت تھے۔

کچھ "ہندوستان چھوڑدو" کا ہنگامہ اور کچھ میم صاحب اکتا گئی تھی۔ اس گندے پچھڑے ملک اور اس کے باسیوں سے۔ اس لئے وہ جلد ہی وطن سدھار گئی۔ انھیں دنوں پھر میری ملاقات جیکسن صاحب سے اسی کھڑکی کے ذریعہ ہوئی۔

"تمھارا ساس نہاچکا۔؟" اس نے بمبئی کی زبان میں بد ذاتی سے مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں صاحب۔ نہاچکا۔ خون کا غسل کیا اس نے!" میں نے تلخی سے کہا۔ چودہ چودہ برس کے چند بچے کچھ ہی دن پہلے ہری نواس پر جو گولی چلی تھی اس میں مارے گئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں کچھ دہی نچے ہونگے جو اس دن جب ٹرک آگئی تھی تو میرے گھر میں چھپ گئے تھے۔ مجھے صاحب سے گھن آنے لگی تھی۔ برٹش سامراج کا جیتا جاگتا ہتھیار میرے سامنے کھڑا ان بےگناہوں کے خون کا مذاق اڑا رہا تھا جو اسکے ہاتھ سے مارے گئے

تھے۔ میرا جی چاہا کہ اسکا منہ نوچ لوں۔ اس کی کونسی آنکھ شیشہ کی تھی، یہ اندازہ لگانا میرے لئے مشکل تھا۔ کیونکہ وہ شیشہ والی آنکھ ولایتی فنکاری کا اعلیٰ نمونہ تھا اسمیں ساری جیکسن کی سفید قوم کی چالبازی بھری ہوئی تھی۔ احساس برتری کا زہر دونوں ہی آنکھوں میں برابر رچا ہوا تھا۔ میں نے دھڑسے کھڑکی کے پٹ بند کر دئے۔

مجھے سکھو بائی پر بہت غصہ آتا تھا۔ سُور کی بچی سفید قوم کے ذلیل کتّے کا تر نوالہ بنی ہوئی تھی، کیا خود اس کے ملک میں کوڑھیوں اور حرام زادوں کی کمی تھی جو وہ ملک کی غیرت کے نیلام پر تُل گئی تھی۔ روز جیکسن شراب پی کر اس کی ٹھکائی کرتا۔ ملک میں بڑے بڑے معرکے سر کئے جا رہے تھے۔ سفید حاکم چند دنوں کے مہمان تھے۔

"بس اب چل چلاؤ ہے انکی حکومت کا" کچھ لوگ کہتے۔

"ابھی یہ شیخ چلّی کے خواب ہیں۔ انھیں نکالنا مذاق نہیں" دوسرے لوگ کہتے۔ اور میں ملک کے نیتاؤں کی لمبی چوڑی تقریریں سن کر سوچتی "کوئی جیکسن کانے صاحب کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ وہ مزے سے سکھو بائی کے جھونٹے پکڑ کر پیٹتا ہے۔ فلو مینا اور بٹو کو مارتا ہے۔ جے ہند کے نعرے لگانے والے اس کمبخت کا کچھ فیصلہ کیوں نہیں کرتے۔"

مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ پچھواڑے شراب بنتی تھی۔ مجھے معلوم تھا سب کچھ مگر میں کیا کر سکتی تھی۔ سُنا تھا اگر ان غنڈوں کی رپورٹ کر دو تو یہ جان کے لاگو ہو جاتے ہیں۔ ویسے مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں تھا کہ کس سے رپورٹ کروں۔ ساری بلڈنگ کے نل دن رات ٹپکتے تھے۔ موریاں سڑ رہی تھیں۔ مگر مجھے قطعی نہیں معلوم تھا کہ کہاں اور کس سے رپورٹ کی جاتی ہے۔ آس پاس رہنے والوں میں بھی کسی کو نہیں معلوم تھا کہ اگر کوئی بد ذات عورت اوپر سے سر پر کوڑے کا ٹین اُلٹ دے تو اسکی کس سے شکایت کرد ایسے موقعوں پر عموماً جس کے سر پر کوڑا گرتا وہ منہ اُونچا کر کے کھڑکیوں کو گالیاں دیتا کپڑے جھاڑتا اپنی راہ لیتا۔

میں نے موقعہ پاکر ایک دن سکھو بائی کو پکڑا۔

"کیوں کمبخت! یہ باجی تمہیں روز پیٹتا ہے تجھے شرم بھی نہیں آتی؟"

"روج کبھی مارتا بائی؟" وہ بحث کرنے لگی۔

"خیر وہ مہینہ میں چار پانچ دفعہ تو مارتا ہے نا؟"

"ہاں مارتا ہے بائی۔ سو ہم بھی سالے کو مارتا ہے۔" وہ ہنسیں۔

"چل جھوٹی۔"

"ارے بچو کا سوگند۔ ہم تھوڑا مار دیا سالے کو پرسوں؟"

"مگر تجھے شرم نہیں آتی۔ یہ سفید چمڑی والے کی جوتیاں سہتی ہے؟" میں نے ایک سچے وطن پرست کی طرح جوش میں آکر اسے لیکچر دے ڈالا۔ "ان لیٹروں نے ہمارے ملک کو کتنا لوٹا ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

"ارے بائی کیا بات کرتا تم۔ صاحب سالا کوئی نہیں لوٹا۔ یہ جو موالی لوگ ہے نا یہ بیچارہ کو دن رات لوٹتا۔ میم صاحب گیا پیچھے سب کٹلری بھٹلری برا لوگ پار کردیا! اکھا پاٹلون، کوٹ، ہٹ، اتنا فسٹ کلاس جوتا۔ سب کھتم۔ دیکھو چل کے بنگلہ میں کوچھ بھی نہیں چھوڑا۔ تم کہتا چور ہے صاحب، ہم بولتا ہم نئیں ہووے تو سالا اس کا بوٹی کاٹ کے لے جاوے اے لوگ۔"

"مگر تمہیں کیوں اس کا اتنا درد ہے؟"

"کائیکو نئیں ہووے درد وہ ہمارا مرد ہے نا بائی۔" سکھو بائی مسکرائی۔

"اور میم صاحب؟"

"میم صاحب سالی پکی چھنال ——!" سکھو بائی نے فیصلہ کیا۔ "ہم اس کو اچھی طرح جانتا۔ ہاں —— لندن میں اسکا بوت یار ہے۔" یہاں پر سکھو بائی نے موٹی سی گالی دے کر کہا۔ "وہیں مری رہتی ہے۔ آتی بی نئیں، پن آتی تو اکھا دن صاحب سے کھٹ کھٹ، نوکر لوگ سے کھٹ کھٹ۔"

میں نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اب انگریز ہندوستان سے جا رہے ہیں۔ صاحب بھی چلا جائے گا۔ مگر وہ قطعی نہیں سمجھی۔ یہی کہتی رہی کہ "صاحب ہم کو چھوڑ کر کیا جائیگا بائی اس کو بلایت ایک دم پسند نہیں"۔

کچھ سال کے لئے مجھے پونا رہنا پڑا۔ اس عرصہ میں دنیا بدل گئی۔ پھر واقعی انگریز چلے گئے۔ ملک کا بٹوارہ ہوا۔ سفید حاکم پٹی ہوئی چال چل گیا اور ملک خون کی لہروں میں نہا گیا۔

جب بمبئی واپس آئی تو بنگلہ کا حلیہ بدلا ہوا تھا۔ صاحب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا بنگلہ میں ایک ریفیوجی خاندان آبسا تھا۔ باہر نوکروں کے کوارٹروں میں سے ایک کوٹھری میں سکھو بائی رہنے لگی تھی۔ فلو مینا خاصی لمبی ہوگئی تھی۔ ٹپو اور وہ ماہم کے قریب ایک یتیم خانے میں پڑھنے جاتے تھے۔

جیسے ہی سکھو بائی کو میرے آنے کی خبر ملی فوراً ہاتھ میں دو چار مونگنے کی پھلیاں لئے آدھمکی۔

"کیسا ہے بائی؟" انھوں نے رسماً میرے گھٹنے دبا کر پوچھا۔

"تم کیسا ہے۔ صاحب کہاں ہے تمہارا؟ چلا گیا نا لندھن!"

"نئیں بائی"۔ سکھو بائی کا منہ سوکھ گیا۔ "ہم بولا بھی جانے کو پر نئیں گیا۔ اس کا نوکری بھی کھلاس ہو گیا تھا۔ آرڈر بھی آیا پر نئیں گیا۔"

"پھر کہاں ہے؟"

"ہسپتال میں!"

"کیوں کیا ہو گیا؟"

"ڈاکٹر لوگ بولتا۔ کہ دارو بہت پیا۔ اس کے کارن سنک بھر گیا۔ ادھر پاگل صاحب لوگ کا ہسپتل ہے۔ اچھا ایک دم فسٹ کلاس اُدھر اس کو ڈالا۔"

"مگر وہ تو واپس جانے والا تھا؟"

"کتنا سب لوگ بولا ہم بھی بولا بابا چلا جاؤ"۔ سکھو بائی رو پڑیں"۔ پن نہیں ہم کو بولا سکھو ڈالنگ تیرے کو چھوڑ کر نہیں جائیں گا"۔

نہ جانے سکھو بائی کو روتے دیکھ کر مجھے کیا ہو گیا۔ میں بالکل بھول گئی کہ صاحب ایک غاصب قوم کا فرد ہے جس نے فوج میں بھرتی ہو کر میرے ملک کی غلامی کی زنجیروں کو جو ہیرا کر دیا تھا جس نے میرے ہموطن بچوں پر گولیاں چلائی تھیں۔ نہتّے لوگوں پر مشین گنوں سے آگ برسائی تھی۔ برٹش سامراج کے اُن گھناؤنے کل پرزوں میں سے تھا جس نے میرے دیس کے جانبازوں کا خون سڑکوں پر بہایا تھا۔ صرف اس قصور میں کہ وہ اپنا حق مانگتے تھے۔ عزت سے جینا چاہتے تھے۔ مگر مجھے اس وقت کچھ یاد نہ رہا سوائے اس کے کہ سکھو بائی کا "مرد" پاگلخانہ میں تھا۔ مجھے اپنے جذباتی ہونے پر بہت دکھ تھا کیونکہ ایک قوم پرست کو جابر قوم کے ایک فرد سے قطعی کسی قسم کی ہمدردی یا لگاؤ محسوس نہ کرنا چاہیے۔

میں ہی نہیں سب ہی بھول چکے تھے۔ محلے کے سارے لونڈے نیلی آنکھوں والی فلو مینا پر بغیر یہ سوچے سمجھے فدا تھے کہ وہ کیڑا جس سے اس کی ہستی وجود میں آئی سفید تھا یا کالا۔ جب وہ اسکول سے لوٹتی تو کتنی ہی ٹھنڈی سانسیں اسکے جلو میں ہوتیں۔ کتنی ہی نگاہیں اس کے پیروں تلے بچھائی جاتیں۔ کسی لونڈے کو اس کے عشق میں سر دھنتے وقت قطعی یہ یاد نہ رہتا تھا کہ یہ اسی سفید درندے کی لڑکی ہے جس نے ہری نواس کے ناکے پر چودہ برس کے بچّہ کو خون میں ڈبو کر مارا تھا جس نے ماہم چرچ کے سامنے نہتی عورتوں پر گولیاں چلائی تھیں کیونکہ وہ نعرے لگا رہی تھیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو"۔

جس نے چوپاٹی کی ریت میں جوانوں کا خون نچوڑا تھا اور سکریٹریٹ کے سامنے سوکھے مارے ننگے بھوکے لڑکوں کے جلوس کو مشین گنوں سے درہم برہم کیا تھا۔ وہ سب بھول چکے تھے۔ بس اتنا یاد تھا کہ کندنی گالوں اور نیلی آنکھوں والی چھوکری کی کمر میں غضب کی لچک ہے۔ موٹے موٹے گدرائے ہوئے ہونٹوں کی جنبش میں موتی رُلتے ہیں۔

ایک دن سکھو بائی جھولی میں پرساد لیے بھاگی بھاگی آئی۔

"ہمارا صاحب آگیا۔" ان کی آواز لرز رہی تھی، آنکھوں میں موتی چمک رہے تھے۔ کتنا پیار تھا اس لفظ "ہمارا" میں زندگی میں ایک بار کسی کو یوں جی جان کا دم نچوڑ کر اپنا کہنے کا موقعہ مل جائے تو پھر جنم لینے کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

"اچھا ہو گیا۔؟"

"ارے بائی پاگل کبھی تھا؛ ایسا ہچ صاحب لوگ پکڑ کر لے گیا تھا، بھاگ آیا۔" وہ رازداری کے لہجہ میں بولیں۔

میں ڈر گئی کہ لو بھئی ایک تو ہارا ہوا انگریز اوپر سے پاگل خانہ سے بھاگا ہوا۔ کس کو رپورٹ کروں بمبئی کی پولیس کے لفڑے میں کون پڑتا پھرے۔ ہوا کرے پاگل میری. بلا سے کون مجھے اس سے میل جول بڑھانا ہے۔

لیکن میرا خیال غلط نکلا۔ مجھے میل جول بڑھانا پڑا۔ میرے دل میں بھی کھد بد ہو رہی تھی کہ کسی طرح پوچھوں جیکسن انگلستان اپنے بیوی بچوں کے پاس کیوں نہیں جاتا۔ بھلا ایسا بھی کوئی انسان ہوگا جو فردوس کو چھوڑ کر یوں ایک کھولی میں پڑا رہے اور ایک دن مجھے موقعہ مل ہی گیا۔ کچھ دن تک تو وہ کوٹھری سے باہر ہی نہ نکلا۔ پھر آہستہ آہستہ نکل کر چوکھٹ پر بیٹھنے لگا۔ وہ سوکھ کر چرخ ہو گیا تھا اس کا رنگ جو پہلے بندر کی طرح لال چقندر تھا جھلس کر کتھئی ہو گیا تھا۔ بال سفید ہو گئے تھے۔ چار خانہ کی لنگی باندھے میلا بنیان چڑھائے وہ بالکل ہندوستان کی گلیوں میں گھومتے پرانے گورکھوں جیسا لگتا تھا۔ اس کی نقلی اور اصلی آنکھ میں فرق معلوم ہونے لگا تھا شیشہ تو اب بھی ویسا ہی چمکدار شفاف اور "انگریز" تھا۔ مگر اصلی آنکھ گدلی بے رونق ہو کر ذرا دب گئی تھی۔ عموماً وہ شیشہ والی آنکھ کے بغیر ہی گھوما کرتا تھا۔ ایک دن میں نے کھڑکی میں سے دیکھا تو وہ جامن کے پیڑ کے نیچے کھڑا کھوئے کھوئے انداز میں کبھی زمین سے کوئی کنکر اٹھاتا اور اسے بچوں کی طرح دیکھ کر مسکراتا پھر پوری طاقت سے اسے

دور پھینک دیتا۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا اور سر ہلانے لگا۔

"کیسی طبیعت ہے صاحب؟" تجسس نے اکسایا تو میں نے پوچھا۔

"اچھا ہے۔ اچھا ہے؟" وہ مسکرا کر شکریہ ادا کرنے لگا۔

میں نے باہر جا کر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنا شروع کیں۔ جلد ہی وہ مجھ سے باتیں کرنے میں بے تکلفی سی محسوس کرنے لگا۔ پھر ایک دن میں نے موقعہ پا کر کریدنا شروع کیا۔ کئی دن کی جانفشانی کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ ایک شریف زادی کا ناجائز بیٹا تھا۔ اس کے نانا نے ایک کسان کو کچھ روپیہ دے دلا کر پالنے پر راضی کر لیا۔ مگر یہ معاملہ اس صفائی سے کیا گیا کہ اس کسان کو بھی پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس خاندان کا ہے۔ کسان بڑا جابر تھا اس کے کئی بیٹے تھے۔ جو جیکسن کو طرح طرح سے زک پہنچایا کرتے تھے۔ روز پٹائی ہوتی تھی۔ مگر کھانے کو اچھا ملتا تھا۔ اس نے بارہ تیرہ برس کی عمر میں بھاگنے کی کوشش کرنا شروع کی۔ تین چار سال کی مستقل کوششوں کے بعد وہ لڑھکتا پڑھکتا دھکے کھاتا لندن پہنچا۔ وہاں اس نے دنیا بھر کے پیشے باری باری اختیار کئے۔ مگر وہ اس عرصہ میں اتنا ڈھیٹ مکار اور خودسر ہو گیا تھا کہ دو دن سے زیادہ کوئی نوکری نہ رہتی۔

وہ شکل وصورت کا وجیہہ تھا اس لئے لڑکیوں میں کافی ہردلعزیز تھا۔ ڈارتھی اس کی بیوی بڑے نک چڑھے خاندان کی لڑکی تھی۔ کم رو اور کم ظرف بھی تھی۔ اس کا باپ بارسوخ آدمی تھا جیکسن نے سوچا کہ اس خانہ بدوشی کی زندگی میں بڑے جھنجھٹ ہیں آئے دن پولیس اور کچہری سے واسطہ پڑتا ہے۔ کیوں نہ ڈارتھی سے شادی کر کے عاقبت سنوار لی جائے۔

ڈارتھی اس کے پاس کی بیٹی اس کی دسترس سے باہر تھی۔ وہ اونچی سوسائٹی میں اُٹھنے بیٹھنے کی عادی تھی۔ مگر جیکسن کی اس وقت دونوں آنکھیں اصلی تھیں۔ یہ تو جب ڈارتھی سے لڑ کر وہ شراب خانوں کا ہو رہا۔ وہاں کسی سے مار پیٹ میں آنکھ جاتی رہی۔ جب تک اس کی صرف بڑی بیٹی پیدا ہوئی تھی۔

"ہاں تو تم نے ڈارتھی کو کیسے گھیر کر پھانسا۔؟" میں نے اور کریدا۔
"جب میری دونوں آنکھیں سلامت تھیں۔" جیکسن مسکرایا۔
کسی نہ کسی طرح ڈارتھی ہتھے چڑھ گئی۔ کمبخت کنواری بھی نہیں تھی مگر ایسے فیل مچائے کہ باپ کی مخالفت کے باوجود شادی کر لی۔ شاید وہ اپنی شادی سے ناامید ہو چکی تھی اور خود اس کی گھات میں تھی۔
باپ نے بھی لڑکی کی مجبوریوں کو سمجھ لیا۔ نیز بیوی کے روز روز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اسے ہندوستان بھجوا دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہر نکما انگریز ہندوستان کے سر منڈھ دیا جاتا تھا۔ خواہ وہ وہاں جوتے گانٹھتا ہو یہاں آتے ہی صاحب بن بیٹھتا تھا۔

جیکسن نے حد کر دی۔ وہ ہندوستان میں بھی ویسا ہی نکما اور لاابالی ثابت ہوا۔ سب سے بڑی خرابی جو اس میں تھی وہ اس کا چھچھورہ پن تھا۔ بجائے صاحب بہادروں کی طرح رعب داب سے رہنے کے وہ نہایت بھونڈے پن سے نیٹو لوگوں میں گھل مل جاتا تھا۔ جب وہ بستی کے علاقہ میں جنگلات کے محکمہ میں تعینات ہوا تو کلب کے۔ بجائے نہ جانے کن کن چنڈو خانوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ آس پاس صرف چند انگریزوں کے بنگلے تھے۔ بدقسمتی سے زیادہ تر لوگ معمر اور بردبار تھے۔ سنسان کلب میں جہاں ہندوستانیوں اور کتوں کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ زیادہ تر اُلّو بولا کرتا تھا۔ سب ہی افسروں کی بیویاں اپنے وطن میں رہتی تھیں۔ جب کبھی کسی افسر کی بیوی ہندوستان آتی تو وہ اسے بجائے جنگل میں لانے کے خود چھٹی لے کر شملہ یا نینی تال چلا جاتا۔ پھر بیوی ہندوستان کی غلاظت سے عاجز آ کر واپس چلی جاتی اور اس کا صاحب ٹھنڈی آہیں بھرتا بیوی کی حسین یاد لئے لوٹ آتا۔ صاحب لوگ ویسے اپنا کام نیٹو عورتوں سے چلا لیا کرتے تھے۔ اس قسم کے تعلقات سے کسی کا بھی نقصان نہیں ہوتا تھا۔ صاحب بھی سستا رہتا تھا۔ ہندوستان کا بھی فائدہ

تھا اس میں ایک تو ان سے پیدا ہونے والی اولاد بادامی اور کبھی خاصی گوری بھی ہوا کرتی تھی۔ دوسرے یہ اولاد باقی نیٹو لوگوں سے زیادہ خوش نصیب ہوتی تھی کیونکہ ان کے بارسوخ باپ ان کے لئے یتیم خانے اور اسکول بھی کھول دیتے تھے۔ سرکاری خرچ پر انکی دوسرے ہندوستانیوں سے بہتر تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ یہ اینگلو انڈین خوش شکل طبقہ انگریزوں سے بس دوسرے نمبر پر تھا۔ لڑکے ریلوے، جنگلات اور نیوی میں بڑی آسانی سے کھپ جاتے تھے۔ جو معمولی شکل کی لڑکیاں ہوتیں انہیں ہندوستانی لڑکیوں کے مقابلہ میں بہتر نوکریاں مل جاتیں اور وہ اسکولوں، دفتروں اور ہسپتالوں کی رونق بڑھاتیں جو زیادہ حسین ہوتیں وہ بڑے بڑے شہروں کے مغرب زدہ بازار حسن میں بڑی کامیاب ثابت ہوتیں تھیں۔

جیکسن صاحب جب ہندوستان آیا تو اس میں کالے شخص کے تمام عیب بڑی افراط سے موجود تھے شراب اسکی عادتِ ثانی بن چکی تھی۔ ہر جگہ اس کی کسی نہ کسی سے پخ چل جاتی اور اس کا تبادلہ ہو جاتا۔ جنگلات سے ہٹا کر اسے پولیس میں بھیج دیا گیا۔ جس کا اسے بہت ملال تھا۔ کیونکہ وہاں ایک پہاڑن پر اسکا بے طرح دل آگیا تھا۔ جبلپور پہنچ کر وہ اسے ضرور بلوا لیتا۔ مگر وہاں اسے ایک نٹنی سے عشق ہو گیا۔ ایسا شدید عشق کہ اس کی بیوی ساری چھٹیاں نینی تال میں گزار کر واپس چلی گئی اور وہ نہ گیا۔ کام کی زیادتی کا بہانہ کرتا رہا چھٹی نہ ملنے کا عذر کیا۔ مگر ڈار تھی کے ڈیڈی کے کتنے ہی دوست تھے جن کے رسوخ کیوجہ سے اسے زبردستی چھٹی دلوائی گئی، جب وہ نینی تال پہنچا تو اسکا وہاں قطعی دل نہ لگا۔ ایک تو ڈار تھی اس کی جدائی میں اس پر بے طرح عاشق ہو گئی تھی۔ اور چاہتی تھی کہ دوبارہ ہنی مون منایا جائے۔ دوسری طرف اسے جیکسن کے طریقہ عشق سے بڑی وحشت ہوتی تھی۔ وہ اتنے دن ہندوستان میں رہ کر بالکل ہی اجنبی ہو چکا تھا۔ پہاڑن اور نٹنی دونوں نے اسکی ہندوستانی پتی ورتا استریوں کی طرح خدمت کرکے اسکا دماغ خراب کر دیا تھا۔ سال میں صرف دو مہینہ کے لئے آنے والی بیوی بھی بالکل اجنبی ہو گئی تھی۔ پھر اس کے

سامنے جیکسن کو تکلفات برتنا پڑتے تھے۔ ایک دن نشہ میں اس نے کچھ بہاڑن اور ہٹنی کے اندازِ محبت کا اپنی بیوی سے مطالبہ کر دیا۔ وہ ایسی چراغ پا ہوئی کہ جیکسن کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے بہت جرح کی بہت کریدا کہ کہیں تم بھی دوسرے بے غیرت اور پنچ انگریزوں کی طرح لوکل عورتوں سے میل جول تو نہیں بڑھانے لگے ہو۔ جیکسن نے قسمیں کھائیں اور ڈارلنگ کے اتنے پیار لیے کہ وہ اس کی پارسائی کی قائل ہو گئی۔ اسے بڑا ترس آیا اور بڑے اصرار سے وہ اُسے جبلپور لے آیا۔ مگر وہ وہاں کی مکھیوں اور گرمی سے بوکھلا کر نیم پاگل ہو گئی اور تو سب جھیل جاتی مگر جب اس کے غسلخانے میں دو موئی نکلی تو وہ اسی وقت سامان باندھنے لگی۔ جیکسن نے بہت سمجھایا کہ یہ سانپ نہیں اور کاٹتا بھی نہیں۔ مگر اس نے ایک نہیں سنا اور دوسرے دن دہلی چلی گئی۔

وہاں سے اس نے زور لگا کر اسکا تبادلہ بمبئی کا کروا دیا۔ یہ اس زمانہ کی بات ہے جب دوسری جنگ شروع ہو چکی تھی۔ ہٹنی کی جدائی اور ڈارلنگ کا بمبئی میں مستقل قیام سوہانِ روح بن گیا۔ سکھو بائی بچوں کی آیا کا ہاتھ بٹانے کے لیے رکھی گئی تھی۔ مگر جب بارش سے جی چھوڑ کر ڈارلنگ مع بچوں کے وطن گئی تو جیکسن کی نظرِ عنایت اِس پر پڑی۔ اُف کتنی اُلجھی ہوئی داستان تھی صاحب کی۔ کیونکہ سکھو بائی اصل میں گنپت ہیڈ بیرے کی رکھیلی عورت تھی وہ اسے پون پل سے پھسلا لایا تھا۔ ویسے بیوی بچوں والا آدمی تھا۔ بوجھ سے بچنے کے لئے اِسے بطور کمائی کے بچوں کی آیا کے نیچے رکھوا دیا تھا۔ سکھو بائی اپنی اس نوکری سے جس میں زمین پونچھنے برتن دھونے کے علاوہ گنپت کے 'ناز اٹھانا' بھی شامل تھا' کافی مطمئن تھی۔

گنپت اسے کبھی اپنے کسی دوست کو بھی از راہِ کرم یا قرضہ کے عوض میں دیدیا کرتا تھا۔ مگر بڑی چالاکی سے کہ بہت دن تک سکھو بائی کو پتہ بھی نہ چلا۔ وہ پینے سے تو پہلے ہی سے واقف تھی۔ گنپت کی صحبت میں پابندی سے شام کو ٹھرا چڑھانے لگی۔ گنپت گاہک کو اپنی کوٹھری میں لے آتا۔ جیکسن کا ڈر تو کسی کو تھا نہیں۔ سب کام کاج چھوڑ کر

نوکر مزے سے جوا کھیلتے، ٹھرا پیتے بلکہ سامنے شیواجی پارک کے غنڈے ڈارکنگ کے جاتے ہی صاحب کے بنگلہ پر ٹوٹ پڑتے اور رات گئے تک ہڑ مچا رہتا۔

شراب جب خوب چڑھ جاتی تو وہ سکھو بائی کو اس آدمی کے پاس چھوڑ کر کسی بہانے سے چلا جاتا۔ سکھو بائی سمجھتی وہ گنپت کو الّو بنا رہی ہے اور آہستہ آہستہ وہ صاحب کی خدمت کرتے کرتے بیوی کی عوضی بھی بھگتنے لگی۔ اس طرح گنپت کے چکر سے چھٹی ملی۔ وہ کمبخت الٹا اسکی ساری تنخواہ اینٹھ لیا کرتا تھا۔ ان ہی دنوں گنپت فوج میں بیرے کی حیثیت سے ٹڈل ایسٹ چلا گیا تھا اور سکھو بائی مستقل میم صاحب کی جگہ جم گئی۔ بس جب چھٹیوں میں میم صاحب آئیں تو وہ اپنی کھولی میں منتقل ہو جاتی۔ اور جب وہ اپنی پتلی کوک دار آواز میں۔

"آیو ددد —" پکارتیں تو وہ فوراً سب کام چھوڑ چھاڑ کے۔

"یس میم صاحب!" کہہ کر لپکتی۔ یوں تو میم صاحب سیکھ کر وہ اپنے آپ کو بڑی انگریزی داں سمجھنے لگی تھی۔ انگریزی زبان میں یس۔ نو۔ ڈیم فول۔ سو آئین کے سوا اور ہے ہی کیا؟ حاکموں کا ان چند الفاظ میں ہی کام نکل جاتا ہے۔ چوڑے ادبی جملوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ٹانگے کے گھوڑے کو ٹخ ٹخ اور چابک کی زبان ہی کافی ہوتی ہے مگر سکھو بائی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ انگریزی کی گاڑی میں جتا ہوا مریل گھوڑا الف ہو کر گاڑی لوٹ چکا تھا اور اب اس کی لگامیں دوسرے ہاتھوں میں تھیں۔ انکی دنیا بڑی محدود تھی۔ وہ خود اسکے دو بچے اور اس کا "مرد"۔

جب میم صاحب ہندوستان آیا کرتی تھیں جب ہی سکھو بائی بڑی فراخ دلی سے عوضی چھوڑ کر پھر بیٹی کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے لگتی۔ اسے میم صاحب سے قطعی کوئی حسد نہیں تھا میم صاحب مغربی حسن کا نمونہ ہو تو ہو۔ ہندوستانی معیارِ حسن کے ترازو میں اُسے تولا جاتا تو جواب صفر ملتا۔

اس کی جلد کھرچے ہوئے شلغم کی طرح کچی کچی تھی۔ جیسے اسے پوری طرح پکنے سے پہلے ڈال سے توڑ لیا گیا ہو۔ یا ٹھنڈی بے جان اندھیری قبر میں برسوں دفن رکھنے کے بعد

نکلا ہو۔ اس کے چھدرے میلی چاندی کے رنگ کے بال بالکل بڑھیوں کے بالوں کی طرح لگتے تھے۔ اس لئے سکھو بائی کے درجہ کے لوگ اسے بڑھیا سمجھتے تھے۔ یا پھر سورج مکھی جسے ہندوستان میں بڑا قابلِ رحم سمجھا جاتا تھا۔ جب وہ منہ دھوئے ہوتی تو اس کی پنسل سے بنائی ہوئی بھویں غائب ہوتیں۔ چہرہ ایسا معلوم ہوتا گویا کسی نے تصویر کو سستے ربڑ سے بگاڑ دیا ہو۔

پھر ڈار تھی سرد تھی، اجنبی تھی جیکسن کا وجود اس کے لئے ایک گھناؤنی گالی تھا۔ وہ اپنے کو نہایت بدنصیب اور مظلوم سمجھتی تھی اور شادی کو ناکامیاب بنانے میں وہ حق بجانب تھی۔ خواہ جیکسن کتنے ہی بلند عہدہ پر پہنچ جاتا وہ اس پر فخر نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ سارے عہدے خود ڈارتھی کے باپ کے دلائے ہوئے ہیں جو کسی بھی احمق کو دلائے جاتے تو وہ آسمانوں کو چھولیتا۔

اس کے برخلاف سکھو بائی اپنی تھی۔ گرما گرم تھی۔ اس نے پون پل پر الاؤ کی طرح بھڑک کر ہزاروں کے ہاتھ تاپنے کا سامان مہیا کیا تھا۔ وہ گنپت کی رکھیلی تھی جو اسے اپنی پرانی قمیص کی طرح دوستوں کو ادھار دیدیا کرتا تھا۔ اس کے لئے جیکسن صاحب دیوتا تھا۔ شرافت کا اوتار تھا۔ اس کے اور گنپت کے پیار کے طریقہ میں کتنا فرق تھا! گنپت تو اسے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے چبا چبا کر تھوکتا اور صاحب ایک مجبور ضرورتمند کی طرح اسے امرت سمجھتا۔ اس کے پیار میں ایک بچّہ جیسی لاچاری تھی۔

جب انگریز اپنا ٹاٹ پلان لے کر چلے گئے تب وہ نہیں گیا۔ ڈارتھی نے اسے بلانے کے سارے جتن کر ڈالے۔ دھمکیاں دیں مگر اس نے استعفیٰ دیدیا اور نہیں گیا۔

"صاحب تمہیں اپنے بچّے بھی یاد نہیں آتے؟" میں نے ایک دن اُس سے پوچھا۔

"بہت یاد آتے ہیں۔ فلو شام کو دیر سے آتی ہے اور بٹو لونڈوں کے ساتھ کھیلنے چلا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ کبھی میرے پاس بھی بیٹھیں۔" وہ اُڑن گھائیاں بتانے لگا۔

"بٹو اور فلو مینا نہیں ایستھر اور لذا۔" میں نے بھی ڈھٹائی لادی۔

"نہیں۔ نہیں" وہ ہنس کر سر ہلانے لگا۔ "پلّے صرف کتیا سے مانوس ہوتے ہیں اس کتے کو نہیں پہچانتے جو ان کے وجود میں سانجھے دار ہوتا ہے" اس نے اپنی اصلی آنکھ مار کر کہا۔

"یہ جاتا کیوں نہیں یہاں پڑا سڑ رہا ہے" یہ میں ہی نہیں آس پاس کے سب ہی لوگوں کو بیچینی سی ہوتی تھی۔

"جاسوس ہے! اسے جان بوجھ کر یہاں رکھا گیا ہے تاکہ یہ ملک میں دوبارہ برطانوی راج کو لانے میں مدد دے" کچھ لوگ یوں بھی سوچتے۔ گلی کے لونڈے جب وہ دکھائی دیتا یہی پوچھتے۔

"صاحب ولایت کب جائے گا؟"

"صاحب کوئٹ انڈیا کاہے کو نہیں کرتا؟"

"ہندوستان چھوڑ دو صاحب!"

"انگریزی چھوڑا چلا گیا"

"وہ گورا گورا چلا گیا"

"پھر تم کاہے کو نہیں جاتا؟" سڑک پر آوارہ گھومنے والے لونڈے اس کے پیچھے پھیری لگاتے آوازے کستے۔

"ہوں ـــــ ہونہوں۔ جائے گا۔ جائیں گا بابا!" وہ سر ہلا کر مسکراتا اور اپنی کھولی میں چلا جاتا۔

تب مجھے اس پر بڑا ترس آتا۔ کہاں ہیں دنیا کے رکھوالے جو ہر کمزور ملک کو تہذیب سکھاتے پھرتے ہیں۔ ننگوں کو پتلون اور فراکیں پہناتے پھرتے ہیں۔ اپنے سفید خون کی برتری کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ انکا ہی خون ہے جو جیکسن کے روپ میں کتنا ننگا ہو چکا ہے مگر اسے کوئی مشنری ڈھانکنے نہیں آتا۔

اور جب گلی کے لفنگے تھک ہار کے چلے جاتے تو وہ اپنی کھولی کے سامنے بیٹھ کر بیڑی پیا کرتا۔ اس کی اکلوتی اصلی آنکھ دور افق پر اس ملک کی سرحدوں کو تلاش کرتی جہاں نہ

کوئی گورا ہے نہ کالا۔ نہ کوئی زبردستی جا سکتا ہے نہ آ سکتا ہے۔ اور نہ وہاں بدکارمائیں اپنے ناجائز بچوں کو تیری میری چوکھٹ پر جن کر خود اپنی باوقار دنیا بسا لیتی ہیں۔

سکھو بائی آس پاس کے گھروں میں کمائن کا کام کرتی۔ اچھا خاصہ کما لیتی۔ اس کے علاوہ وہ بانس کی ڈلیاں، میز کرسی وغیرہ بنا لیتی تھی۔ اس ذریعہ سے کچھ آدنی ہو جاتی جگین بھی اگر نشہ میں نہ ہوتا تو اُلٹی سیدھی بے ہنیدے کی ٹوکریاں بنایا کرتا۔ شام کو سکھو بائی اس کے لئے ایک بھرّے کا ادھا لادیتی جو وہ فوراً چڑھا جاتا اور پھر اس سے لڑنے لگتا ایک رات اس نے نہ جانے کہاں سے بھرّے کی پوری بوتل حاصل کرلی اور ساری رات پیتا رہا۔ صبح دم وہیں کھولی کے آگے پڑ کر سو گیا۔ فلوینا اور جگو اس کے اوپر سے پھلانگ کر اسکول چلے گئے، سکھو بائی بھی تھوڑی دیر اسے گالیاں دے کر چلی گئی۔ دوپہر تک وہ وہیں پڑا رہا۔ شام کو جب بچے آئے تو وہ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اسے شدید بخار تھا جو دوسرے دن بڑھ کر سرسام کی صورت اختیار کر گیا۔ ساری رات وہ نہ جانے کیا بڑبڑاتا رہا نہ جانے کسے یاد کرتا رہا۔ شاید اپنی ماں کو جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا جو شاید اسوقت کسی شاندار ضیافت میں شریک "اخلاقی اصلاح بندی" پر تبصرہ کر رہی ہوگی۔ یا وہ باپ یاد آرہا ہو جس نے نسل چلانے والے سانڈ کی خدمات ادا کرنے کے بعد اسے اپنے جسم سے بہی ہوئی غلاظت سے زیادہ اہمیت نہ دی۔ اور جو اس وقت کسی دوسرے محکوم ملک میں بیٹھا قومی اقتدار قائم رکھنے کے منصوبے بنا رہا ہوگا۔ یا ڈار کمتی کے طعنوں بھرے احسان یاد آ رہے تھے جو بیرحم کسان کے ہنٹروں کی طرح ساری عمر اس کے احساسات پر برستے رہے یا شاید وہ گولیاں جو اس کی مشین گن سے بیگناہوں کے سینوں کے پار ہوئیں اور آج پلٹ کر اس کی روح کو ڈس رہی تھیں ــــــ وہ رات بھر چلاتا رہا، سر پٹختا رہا۔ سینے کی دھونکنی چلتی رہی۔ درد دیوار نے پکار پکار کر کہا۔

"تیرا کوئی ملک نہیں۔ کوئی نسل نہیں۔ کوئی رنگ نہیں"

تیرا ملک اور رنگ سکھو بائی ہے جس نے تجھے بے پناہ پیار دیا۔ کیونکہ وہ بھی تو اپنے

دیس میں غریب الوطن ہے۔ بالکل تیری طرح۔ ان کروڑوں انسانوں کی طرح جو دنیا کے ہر کونے میں پیدا ہوتے ہیں۔ نہ انکی ولادت پر شادیانے بجتے ہیں۔ نہ موت پر ماتم ہوتے ہیں۔

پو پھٹ رہی تھی۔ ملوں کی چمنیاں دھواں اُگل رہی تھیں اور مزدوروں کی قطاروں کو نگل رہی تھیں۔ تھکی ہاری رنڈیاں اپنے رات بھر کے خریداروں کے چنگل سے پنڈا چھڑا کر انھیں رخصت کر رہی تھیں۔

"ہندوستان چھوڑ دو۔"

"کوئٹ انڈیا۔"

طعن اور نفرت میں ڈوبی آوازیں اس کے ذہن پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہی تھیں۔ اس نے ایک بار حسرت سے اپنی عورت کی طرف دیکھا جو وہیں پٹی پر سر رکھ کر سو گئی تھی۔ فلومینا رسوئی کے دروازے میں ٹاٹ کے ٹکڑے پر سو رہی تھی۔ پٹو اس کی گود میں منہ گھسائے پڑا تھا۔ کلیجہ میں ایک ہوک سی اُٹھی اور اس کی اصلی آنکھ سے ایک آنسو ٹپک کر میلی دری میں جذب ہو گیا۔

برطانوی راج کی مٹتی ہوئی نشانی ایرک ولیم جیکسن نے ہندوستان چھوڑ دیا۔

رضیہ سجاد ظہیر

سَنٹی

عید کے دس بارہ روز پہلے ہی سے نورو نے دوکانوں میں جھانکنا شروع کر دیا تھا! اس نے تھوڑا تھوڑا کر کے پندرہ سولہ روپے بچائے تھے۔ کسی کا دینا کچھ تھا ہی نہیں اور بارہ بنکی کے ایک گاؤں میں جانے کے بھی ایسے کون سے بہت سے پیسے لگتے تھے۔ پچھلی عید پر وہ گھر نہیں گیا تھا، کیونکہ عید سے کچھ ہی دن پہلے وہ چچا سے لڑ کر لکھنؤ آیا تھا، تو کیسے جاتا ——؟

اس کی نظر طاق میں رکھے ہوئے پوسٹ کارڈ پر پڑ گئی جو اسے ابھی دو ہی دن ہوئے ملا تھا، چچا کی طرف سے —— لکھا تھا:۔

"سب بڑوں کو سلام چھوٹوں کو دعا۔ اور اللہ کے فضل سے ہم سب روزے رکھ رہے ہیں اور یہ رمضان شریف کا مبارک مہینہ ہے جب اللہ کی رحمتیں اپنے گنہ گار بندوں پر آسمان سے اترتی ہیں۔ اس لئے غصّہ کو تھوک دو، اور عید پر اب کی چلے آؤ۔ ہمارا نہیں تو اپنی بیوہ ماں اور ننھی سی بہن کا خیال کرو، جو ہر گھڑی تم کو یاد کرتی ہے اور تھوڑے لکھے کو بہت سمجھنا اور خط کو تار سمجھنا۔"

نورو کی آنکھوں کے سامنے وہ ننھی سی فراک منڈلانے لگی جو نکڑ والی پنجابی کپڑے والے کی دوکان میں سامنے ہی ٹنگی لہراتی دیکھی تھی —— پیلی، چمکدار، جس پر لال کپڑے کے پھول ٹنکے تھے —— ہرے چمکدار کپڑے کی بو گلے کے پاس بنی ہوئی تھی اور سفید

پلاسٹک کے بٹن لگے تھے ـــ وہ اس کی ننھی بہن کو بالکل ٹھیک آئے گی ـــ"

ڈھائی روپے کی وہ فراک اور دو آنے کا ایک گز ربن چوٹی کے لیے، دو آنے کی مہندی اور چار آنے کی چوڑیاں ـــ اماں کے لئے بارہ آنہ سیر والی سوّیاں، اور ایک روپے کی سیر بھر شکر، چچا کے لئے نماز پڑھنے کے واسطے ایک ٹوپی ـــ پھر اس کی نظریں یکایک اپنی چپل پر پڑ گئیں ـــ اگر ایک چپل نئی آجاتی تو بڑا اچھا ہوتا۔ لیکن گھر جاتے وقت کچھ نقدی بھی ساتھ ہونی ضروری ہے ورنہ اپنے پرائے کہیں گے کہ شہر گئے بھی اور چار پیسے بھی ہاتھ میں نہیں دیکھ رہے ہیں ـــ چلو اسی کو پالش کرا لیں گے ـــ ہوگا! عید بعد دیکھا جائے گا! اس وقت جوڑا بن جائے، یہی بہت ہے ـــ

وہ اٹھا ـــ اِدھر اُدھر دیکھ کے طاق میں سے ایک پڑیہ اٹھائی، اس میں کچھ نمکین سیو تھے، ان کا پھنکا لگا کے گھڑے میں سے پانی پیا، صندوق کھول کر روپے نکالے، گن کر لال قمیص کی جیب میں رکھے اور اپنے اُٹنگے خاکی پتلون کی پیٹی کس ہی رہا تھا کہ دروازے پر کھڑ کھڑ ہونے لگی ـــ پھر کوں کوں کی آواز آئی!

اس نے دروازہ کھول دیا، اور بولا "اونہوں! پھر آگئے تم یار، تم کو دو چار دن چائے کیا پلا دی کہ تم تو جان ہی کو اٹک گئے۔"

ایک دبلا پتلا، سوکھا سا بھورے رنگ کا کتا منہ اٹھائے اسے بڑی حسرت سے دیکھ رہا تھا!

"بھئی آج تو تمھارے لئے کچھ ہے نہیں بھورو! اب بات یہ ہے کہ ہم جا رہے ہیں گھر، اماں سے ملنے ننھی کو پیار کرنے اور ان بڑھئو کو سلام کرنے جن سے ہمارا جھگڑا ہو گیا تھا نہ ـــ اب ہم انسانوں سے ملنے جا رہے ہیں ـــ کتوں سے اب ہماری دوستی ختم سمجھئے۔"

کتا کھڑا کوں کوں کرتا رہا۔ دم ہلاتا رہا، کندھے تھرتھراتا رہا! "اچھا دیکھو دیکھتے ہیں،" نورو طاق کی طرف مڑا!

اس موقعہ سے فائدہ اٹھا کر، کتا سٹ سے اس کی ٹانگوں سے کترا کر اندر گھس گیا اور کوٹھڑی کے ایک کونے میں اس طرح بیٹھ گیا، جیسے وہ اس کا ہی بسیرا تھا،___ دم پٹا پٹ زمین پر مارتے ہوئے وہ برابر نورو کو گھورے جا رہا تھا___ آس لگائے امید باندھے!

نورو نے ادھر ادھر ڈھونڈا، اور جب اسے کچھ نہیں ملا تو وہ کھسیا کر بگڑ گیا،___ "نکل___ اب کہاں سے تیرے لئے کچھ لاؤں؟ صبح کیوں نہیں آیا جب چار بنی تھی؟___ کہاں تھا؟ ہیں؟ اب نکل، چل اب کوٹھڑی بند کرنی ہے، چل___ نکل"___

اس نے کونے میں رکھی ہوئی پتلی سی سنٹی اٹھائی جو اس نے کل ڈپٹی صاحب کے یہاں سواری پہنچا کے ان ہی کے احاطے میں لگی ہوئے نیم سے توڑی تھی!

کتے نے اس کو حیران نظروں سے دیکھا___ ایک بار منہ کھولا اور پھر بند کیا، سر ہلا کے کوں کی ایک آواز نکالی اور پچھلی ٹانگوں میں دم دبا کر الٹے پاؤں دروازے کی طرف آہستہ آہستہ کھسکنے لگا۔ کھسکتے کھسکتے وہ ہاتھ میں سنٹی اٹھائے ہوئے نورو کو بڑی حسرت سے تکتا جا رہا تھا۔ اس کے باہر نکلنے کی رفتار اتنی سست تھی کہ نورو اور بھی کھسیا گیا، زور سے اگلا پیر زمین پر پٹک کر بولا "نکل، دھت"___

کتے نے ایک گرتی پڑتی جست لگائی اور باہر نکل گیا! نورو نے دروازے میں تالا بند کیا اور سامنے ٹین پر پڑے ہوئے چھپر کے نیچے سے اپنا رکشہ نکالنے چلا___ چلتے چلتے اس نے مڑ کر دیکھا تو بھورو اس کے پیچھے پیچھے لگا تھا۔ اس نے ایک الٹی لات چلائی "نکل دھت۔"

بھورو نے ایک سکنڈ اسے تعجب سے دیکھا___ پھر اپنی جگہ رک کر دم ہلانے لگا!

نورو نے رکشہ گھسیٹا، کندھے پر سے انگوچھا اتار کر اسے ادھر ادھر سے جھاڑا، پاس لگے ہوئے گیندے میں سے دو تین پھول توڑ کر، ان کا گلدستہ بنایا، اسے رکشہ کے ہینڈل میں اٹکایا، اچک کے رکشے پر بیٹھا اور روانہ ہو گیا۔ پیڈل مارتے، مارتے ایک بار پھر اس نے اپنی جیب ٹٹول کر دیکھی___ اس کے پاس پندرہ روپے کچھ آنے تھے!

چوڑیوں کے علاوہ سب خریداری کر کے اسے ایک ایسی سواری مل گئی جو نشاط گنج جانا چاہتی تھی ـــــ وہ خود بھی نشاط گنج جانا چاہتا تھا۔ وہاں اس نے کل رات کو ایک دکان پر بہت اچھی اور کافی سستی چوڑیاں دیکھی تھیں۔

کاٹھ کے پل پر اس نے پیڈل سے دونوں پاؤں الگ، الگ پھیلا دیئے۔ رکشہ ڈھال پر چھوڑ دیا اور گنگنانے لگا!

ایک دم پیچھے سے آواز آئی،، ابے نورو ـــ لائسنس نہیں ہو تو آگے مت جانا ـــــ چکن ہو رہی ہے، چکن! پانچ سے کم نہیں بھرنے پڑیں گے۔،،

یہ اس کے ایک دوست کی آواز تھی، جو رکشہ ہی چلایا کرتا تھا، مگر اس وقت ایک خاکی رنگ کا تھیلا کندھے پر ڈالے، مٹھی میں دبی بیڑی کے کش، انگوٹھے کے پاس سے کھینچتا، اینڈتا ہوا، اطمینان سے گھوم رہا تھا!

نورو کا دل دھک سے رہ گیا!

لائسنس تو اس کی کالی بش شرٹ کی جیب میں تھا۔ آج جب اس نے یہ لال قمیص پہنی، اور اس کی جیب میں روپے رکھے تو وہ کالی بش شرٹ کوٹھری میں کیل ہی پر ٹنگی رہ گئی تھی! ـــــ جب تک وہ پیڈل پر پاؤں جماتا، اور کچھ سوچ پاتا، رکشہ تیزی سے ڈھال پر خود ہی ڈھلکتا ہوا ٹھیک اسی جگہ پہنچ گیا جہاں چیکنگ ہو رہی تھی!

وہ پھنس چکا تھا!

بڑی حسرت سے اس نے رکشہ میں بیٹھے، سوٹ پہنے، پان چباتے ہوئے بابوجی کی طرف دیکھا اور رکھِسیں سے بولا:۔

،، بابو جی، اگر آپ گواہی دے دیں کہ میرے پاس لائسنس ہے، تو میں چھوٹ جاؤنگا،،

،، پر مجھے کیا معلوم کہ تمھارے پاس لائسنس ہے؟،، بابوجی غرائے اور رکشہ سے اترنے لگے۔

،، بابوجی، میرے پاس ہے لائسنس، میں ابھی لاکے دکھا سکتا ہوں۔ آپ میرے ساتھ چلیں

تو بس آپ کا دس منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا یہیں بالکل پاس ہے میرا گھر، مجھے پتہ نہیں تھا کہ آج چکن ہو رہی ہے، ورنہ روز تو میں اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ہیں بابو جی؟ موڑ لوں رکشہ،،

مگر بابو جی رکشہ سے اتر چکے تھے! — اس جگہ سے ذرا سا آگے کے لئے انھوں نے آٹھ آنے طے کئے تھے، یہ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے ایک چونی نکالی اور اس کی طرف پھینک کر نو دو گیارہ ہو گئے! مثل ہے بندھا ہر طرف سے پٹتا ہے!

عید کی صبح تھی —— نورو کوٹھری کا دروازہ اندر سے بھیڑے ہوئے، سر جھکائے بیٹھا تھا —— ایک طرف کونے میں بندھی ہوئی رسّی کی الگنی پر ایک نئی دھاری دار قمیص اور ایک جھنا لٹھے کا پاجامہ لٹک رہا تھا، دوسری طرف ایک پیلی جھکدار فراک لہرا رہی تھی اور اسی کے پاس ربن جھول رہا تھا، ہرے رنگ کی ٹوپی گلابی پتلے کاغذ میں لپٹی پوسٹ کارڈ میں طاق میں رکھی تھی۔ شاید اس کے رکھے جانے ہی سے پوسٹ کارڈ کا ایک کونا ذرا باہر کو کھسک آیا تھا جس پر لکھا تھا،

"اور یہ رمضان کا مبارک مہینہ ہے، جب اللہ کی رحمتیں اپنے گنہ گار بندوں پر آسمان سے اترتی ہیں۔،،

دودھ والا نورو کو صبح کو پاؤ بھر دودھ حسب دستور دے گیا تھا؛ اس نے اماں کو دے جانے والی سویوں میں سے تھوڑی سے سویاں بھی ابال لی تھیں، مگر یہ سب کچھ پیالے میں بھرا کونے میں رکھا تھا —— اس نے کھانے کی کوشش تو کی تھی مگر اکیلے کیا کھایا جاتا —— آس پاس کے دو ایک ساتھی نماز پڑھنے چلے گئے تھے، مگر اس نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا تھا —— ؟

دیوار سے ٹیک لگا کر اس نے ایک بار پھر پیالے کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ دروازے پر کھر کھر ہوئی، پھر کوں کوں کی آواز آئی پھر بھورے نے اپنے منہ سے دروازہ ذرا سا کھول دیا۔ اگلے پنجے اندر رکھے اور گردن اٹھا کے نورو کا منہ تکنے لگا جیسے آنے کی اجازت

مانگ رہا ہو۔!

نورو مسکرا پڑا!

بھورو نورو اُس کی مسکراہٹ کو سمجھ گیا' آدھا اندر آگیا' اور منھ اٹھا کر کندھے تھرتھراتے ہوئے گوں کی آواز نکالی!

— "آؤ — آؤ دوست!" نورو نے کہا — اور پھر وہ مٹی کی رکابی لینے لگا' جسمیں وہ بھورو کو کھانا دیا کرتا تھا!

نورو کو اٹھتے دیکھ کر کتا کونے میں دبک گیا' دم پچھلی ٹانگوں میں سمیٹ لی اور اُس کی نمناک آنکھیں' خوف کی پرچھائیاں لئے کونے میں رکھی ہوئی نیم کی سنٹی پر جم گئی!

نورو نے ایک دم آگے بڑھ کر سنٹی اٹھائی اور اُسے دو ٹکڑے کر کے باہر پھینک دیا!

پھر اس نے پیالے سے اوپر کا دودھ رکابی میں "انڈیلا"' اپنا پیالہ اپنے ہاتھ میں لیا اور دودھ کی رکابی بھورو کی طرف کھسکاتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا — پیٹھ دیوار سے لگائی اور بولا — "آؤ دوست — ہم دونوں کھائیں — آؤ"۔

بھورو نے اسے ایک پل حیران ہو کر دیکھا' پھر سر ہلایا کندھے تھرتھرائے' ذرا سا جھجکا۔ پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اور پھر ایک دم سے رکابی میں منھ جھکا دیا۔

نورو نے بھی پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا تھا' اور میٹھی سویوں میں کچھ نمک کا مزہ بھی شامل ہوتا جا رہا تھا!

شفیق الرحمٰن

دجلہ

ایک ویرانے میں ٹامیوں نے بورڈ لگا رکھا تھا ——— "بغداد جانے والو! سو میل تک شمال مغربی سمت میں جاکر دو سو میل سیدھے نکل جاؤ، اس سے آگے پچاس میل تک بائیں دائیں دیکھتے جاؤ جہاں آبادی نظر آئے رُک جاؤ ——— یہی بغداد ہے!"

بغداد جاتے وقت سفر بالکل اسی قسم کا تھا۔ مجھے بغداد سے زیادہ دجلے کو دیکھنے کا شوق تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اُس کی دنیا دجلہ و دیوب دنیل والا دجلہ عام دریاؤں جیسا ہرگز نہیں ہوگا۔ بڑی ممتاز شخصیت کا مالک ہوگا۔ کافی دیر کے بعد ایک بھوری سی ندی نظر آئی ——— روز بولا ——— آہا دجلہ آگیا۔ موٹر ٹھہرا کر اُسے قریب سے دیکھا۔ اوپر مٹیالا آسمان تھا۔ خشک سے کناروں کے بیچ میں گارا سا بہہ رہا تھا۔ دریاؤں کے قریب پہنچو تو پہلے درختوں کے جھنڈ آتے ہیں اور کچھ نہیں تو نرسل یا سبزہ ہی دکھائی دیتا ہے لیکن یہاں کنارے پر کچھ نہیں تھا۔ کنارے بھی پانی کی سطح سے اونچے تھے۔ اگر اندھیرا ہو تو انسان چلتا چلتا سیدھا دجلے میں آئے۔ سعدیؔ کا بسالے دجلہ گرد و خشک رود' یاد آگیا۔

میں جن لوگوں کے ساتھ تھا اُن کا میرا ساتھ عراق تک تھا، پھر مجھے واپس آنا تھا۔ ریت میں اٹے ہوئے منزل مقصود تک پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کیمپ کے نئے مہتمم کی تقریر ہونے والی ہے۔ مجمع میں، ہندوستانی، انگریز، عراقی، کرد سب موجود تھے۔ ایک سُرخ رنگ کا لمبا تڑنگا شخص نمودار ہوا ——— پچپن ساٹھ کا ہوگا۔ تیر کی طرح سُتا ہوا

بے تحاشہ گھنی بھویں اور بڑی بڑی بل کھاتی ہوئی مونچھیں جو سفید ہوتی جا رہی تھیں دور سے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ مونچھیں بڑی ہیں یا بھویں۔

"میرا نام برٹن ہے اور میں آج صبح آیا ہوں۔ بلکہ بھیجا گیا ہوں۔ آپ میرے لئے اجنبی ہوں تو ہوں یہ علاقہ اجنبی نہیں، چوبیس سال ہوئے جب آپ میں سے بیشتر حضرات چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ میں یہاں جنگ میں لڑنے آیا تھا اور کئی برس رہا۔" ایک وجیہہ شخص نے ان فقروں کا عربی میں ترجمہ کیا ——— "تب سے میں مشرقِ وسطیٰ میں رہا ہوں اور ان ملکوں کے چپے چپے سے واقف ہوں، لہٰذا میرے لئے یہ علاقہ پراسرار نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ نسیم سحری چلتی ہے تو کیا اثرات پیدا ہوتے ہیں! ——— گرد اڑتی ہے! بل کھاتی ہوئی سحرانگیز گلیوں میں کیا ہوتا ہے، شور وغل مچتا ہے۔ اور مکھیاں بھنبھناتی ہیں! بغداد میں چاندنی راتوں کے طلسم سے بھی شناسا ہوں ——— گیارہ بارہ بجے تک گلیں لگتی ہیں۔ اس کے بعد کتے چاند کی طرف منہ کرکے روتے ہیں۔ ساتھ ساتھ اپنے ملک کے شہروں سے بھی واقف ہوں ——— جب مانچسٹر میں صبح ہوتی ہے تو دھوئیں اور دھند کے مارے ہوئے پرندے چہچہانے کی بجائے کھانسنا شروع کر دیتے ہیں۔ لندن میں بدھ کو بہار آتی ہے اور اگلے دن جمعرات کو موسم بہار ختم ہو جاتا ہے ——— لہٰذا آپ مجھے دوسرے اجنبیوں جیسا نہ سمجھیں ——— میں یہاں کچھ عرصے کے لئے ہوں پھر یہاں کے گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں کو چھوڑ کر کسی دوسرے ملک کے گرد و غبار، مکھیوں اور جھلستی ہوئی دوپہروں میں زندگی گزارنے چلا جاؤں گا ——— یہ واضح رہے کہ میں وہ سب کچھ کر سکتا ہوں جو آپ کر سکتے ہیں ———"

عربی میں ترجمہ ہوا تو ایک طرف سے آواز آئی ——— "واللہ یا ابو شوارب!"

"یہ کون تھا؟" برٹن نے پوچھا۔

مشکی رنگ کا ایک بدو کھڑا ہو گیا۔

"شکریہ یا ابو ملاحت!" برٹن نے جھک کر شکریہ ادا کیا۔

واللہ واللہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور ہجوم ہنسنے لگا. ہمیں بتایا گیا کہ جہاں بدو نے برٹن کو مونچھوں کے ابّا کہا تھا اس نے جواباً نمکینی کے ابّا کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ وہ یہاں کے رواج سے واقف ہے کہ سب سے نمایاں خصوصیت کے ساتھ ابو لگا کر نام رکھ دیتے ہیں (ننھے کے ابّا سے اُس کا کوئی واسطہ نہیں) اُس دن سے برٹن کا نام ابو شوارب پڑ گیا۔

جو شخص ترجمہ کر رہا تھا وہ مقامی باشندوں سے بالکل مختلف تھا. ماتھے پر تیوری چڑھائے یوں بیٹھا تھا جیسے ماحول سے بیگانہ ہو. بار بار نوک دار مونچھوں کو تاؤ دیتا اور عقاب کی سی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھتا، پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا اصل وطن کردستان ہے. نام بہت طویل تھا دو ابو آتے تھے تین چار ابن اور پانچ آل جب جا کر مکمل ہوتا تھا لیکن سب اسے منصور کہتے تھے.

شام کو دریا کے کنارے کرسیاں بچھائی گئیں. آفتاب غروب ہوا تو برٹن اور بوتلیں پہنچ گئیں. پہلے نو واردوں کا تعارف کرایا گیا. پھر گلاس سامنے رکھے گئے. میرے انکار پر وجہ دریافت کی گئی —— میں نے بتایا کہ مجھے کھیل کود کا بہت شوق ہے اور اس چیز سے توانائی کم ہو جاتی ہے ——'

"بالکل نوجوانوں والی بات کی ہے. اس عمر میں طرح طرح کی باتیں سوجھتی ہیں."

برٹن ہنسنے لگا. کھیلوں کا ذکر شروع ہو گیا —— مجھے کرکٹ بالکل پسند نہیں. ایک مرتبہ غلط بلا گھما دو تو آؤٹ ہو کر میدان سے فوراً باہر نکلنا پڑتا ہے —— دوسرے کھیلوں میں کم از کم ایک گھنٹہ تو کھیلنے دیتے ہیں —— پھر پولو پر پہنچے —— میں رسالے میں تھا اب تک گھوڑے یاد آتے ہیں. گھوڑوں کی خوشبو یا بو ٹینکوں کے پٹرول سے کہیں زیادہ خوش گوار تھی —— مصیبت تو یہ ہے کہ مشینوں سے کام لینے کے لئے دماغ لڑانا پڑتا ہے. گھوڑے ڈانٹنے پیٹنے سے مان جاتے تھے. مشینوں کو جتنا مروڑو اتنی ہی بگڑتی چلی جاتی ہیں. —— پولو کے بعد نیزہ بازی، گھڑ دوڑ سے ہوتے ہوئے

معاملہ مچھلیوں کے شکار پر اٹک گیا۔

جب لوگ جمائیاں لے رہے تھے تو وہ مجھے سمجھا رہا تھا کہ سامن اور ٹراوٹ کی عادتوں میں کیا فرق ہے اور کیوں فرق ہے۔ میں بالکل خاموش بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس ریگستان سے کب چھٹکارا ملے گا۔ اگر پرسوں نجات مل جائے تو سنیچر کو یعنی آج کی رات اس وقت جہاز میں ہوں گا۔ چاندنی ہوگی۔ اور سمندر کی لہریں ــــــ

اگلے روز برٹن نے مجھے بلا کر کہا ــــــ "تمہاری کل شام کی گفتگو پسند آئی۔ میں نے بغداد ٹیلیفون کر دیا ہے کہ ہمیں کچھ عرصے کے لئے یہاں رہنے دیا جائے ــــــ"

اسکے بعد یہ بتایا کہ رات کو اس کے خیمے میں چوری ہوئی اور کوئی سارے سگار، وسکی کی بوتلیں اور کافی کے ٹین لے گیا۔ "باقی چیزیں تو بچ گئیں ــــــ" میں نے پوچھا۔

"اسکے علاوہ وہاں کچھ تھا ہی نہیں ــــــ"

رات کو کیمپ میں بڑا سخت پہرہ ہوتا تھا، پھر بھی چور نالی میں لیٹ کر سرکتا سرکتا آیا اور اسی طرح واپس چلا گیا۔ صبح کو نالی برٹن کے خطوط سے بھری ہوئی تھی جنھیں چور بیکار سمجھ کر پھینک گیا تھا ــــــ "کوئی پڑھا لکھا چور تھا۔ وہ خط میرے بھتیجوں کے بھیجے ہوئے تھے ــــــ لیکن فقط میری ہی چیزیں کیوں چرائی گئیں، آس پاس بھی تو خیمے تھے ــــــ!"

"شاید آپکی تقریر کو چیلنج سمجھا گیا ہو ــــــ"

"تمہارا قیاس صحیح ہے۔ پچھلی جنگ میں جب میں یہاں آیا۔ تب بھی میں نے کیمپ کے مزدوروں اور مقامی سویلین لوگوں کے سامنے اسی قسم کی تقریر کی تھی ــــــ"

"تب کیا ہوا تھا؟"

"تب بھی چوری ہوئی تھی ــــــ اسی رات!"

اگلے روز کسی نے شکایت کی کہ ڈاک خانے سے ٹکٹ نہیں ملتے۔ پوسٹ ماسٹر سے پوچھا۔ تو اس نے سر پیٹ کر بتایا۔ ٹکٹوں اور نقدی والا مقفل صندوق زنجیر سمیت غائب

ہوگیا ہے۔ پھر اتنی چوریاں ہوئیں کہ ہم نے افسوس کرنا چھوڑ دیا۔

خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ درجۂ حرارت سائے میں ۱۳۰ تک پہنچ جاتا (لیکن سایہ ندارد ۱
تھا) صبح نو دس بجے تک کام کرتے یا پھر سہ پہر کے بعد۔ باقی وقت خیموں میں چھپے رہتے۔ برٹن بڑا محنتی اور سخت جان تھا، جس تندہی سے خود کام کرتا، اسی کی توقع اپنے ماتحتوں سے رکھتا، کام کے اوقات میں وہ ہم پر کڑی نگاہ رکھتا۔ نہ کسی کو بیجا تنا نہ کوئی فالتو بات کرتا، لیکن جہاں شام ہوئی ایسا بدل جاتا کہ پہچان نہ سکتے کہ یہ وہی تلخ و جابر برٹن ہے۔ بالکل دوستوں کی طرح ملتا۔ قہقہے لگاتا، مشورے دیتا۔ آندھی آئے اولے چلے۔ اس کے منہ سے شکایت کا ایک لفظ نہ نکلتا۔ جب دیکھو لبوں پر مسکراہٹ ہے۔ مونچھیں تنی ہوئی ہیں۔ سینہ نکالے کہنیاں پھیلائے پیدل چکر لگاتا ہے۔

اسے فیلولے سے سخت چڑ تھی۔ کسی پر شبہہ ہو جاتا کہ یہ دن میں سوتا ہے تو اُسے تنگ کرتا، ذرا ذرا سی دیر کے بعد اردلی آتا —— "برٹن صاحب نے سلام بھیجا ہے" وہ غریب لباس ٹھیک کر کے پہنچتا —— "اوہ تمھیں نہیں روز کو بلایا تھا" —— اگر روز ہوتا تو کہتا۔ "افسوس تمھیں نہیں نبل کو بلایا تھا۔"

ٹیلی فون پر گفتگو ختم کرنے سے پہلے چیرز cheers ضرور کہتا۔ خواہ موضوع کیسا ہی ہو۔ دفتر سے اکثر آواز آتی —— "رچرڈ تم سا سست اور نکما انسان میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اسی وقت واپس کیمپ پہنچو میں تمھاری خبر لوں گا —— چیرز!" یا "سمتھ! ابھی موصل سے اطلاع آئی ہے کہ تمھارا سامان چوری ہوگیا ہے چیرز!" یا "جو حکم ملا ہے اسے فوراً بجا لاؤ، بحث مت کرو، خاموش رہو —— چیرز!"

میں وطن سے پہلی مرتبہ باہر نکلا تھا، ہر بات کو بڑی توجہ سے سنتا، ہر چیز کو غور سے دیکھتا —— برٹن کی باتیں بہت اچھی لگتیں —— "لڑکو قسمت آزمائی اور منچلے

پن کے بھی دن ہیں جگہ جگہ جاؤ دنیا دیکھو، لوگوں سے ملو تجربہ حاصل کرو۔ تجربے کا بدل نہیں ہے ___ یہ کتابیں نصیحتیں اور لیکچر سب جمع خرچ ہے ___ عمر کے ساتھ ساتھ خون کی حرارت کم ہوتی جائے گی، ایک مرتبہ نظریئے پختہ ہوئے تو پھر سارے دروازے بند ہو جائیں گے ___" ___ "جس طرح کھیلوں کے مقابلے کے لئے کھلاڑی ٹریننگ کرتے ہیں اسی طرح آفتوں، حادثوں اور غیر متوقع واقعات کے لئے ذہن کی ٹریننگ ہونی چاہئے ___ ڈرنے کی بجائے ذہنی طور پر تیار رہو، مصیبتوں کا مزہ چکھے بغیر لڑکا مرد نہیں بنتا۔"

اس کی میز پر مغربی شعراء کی نظموں کا مجموعہ رکھا تھا ___ کسی نے پوچھا تو بولا "شاعری کا شوق اتنا ہی ہے کہ پڑھ کر خوش ہو لیتا ہوں لیکن اگر مجھے شاعر بننے کے لئے کہا جائے تو شاید انکار کر دوں۔ شعر کہنے کے لئے ان دیکھی ان جانی عجیب عجیب باتیں سوچنی پڑتی ہیں۔ بار بار فرضی باتیں سوچو تو اُن پر یقین سا ہونے لگتا ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ اور ہیں ___"

چنانچہ دجلے کے کنارے شام کو محفلیں جمتیں تو ان میں میں بطور طالب علم شریک ہوتا۔ روز اور نمبالکر میرے ساتھ آئے تھے، وہاں پہنچ کر پہلے برٹن سے واقفیت ہوئی پھر منصور احمد جرجیس سے۔ منصور خود ہم سے نہیں ملا، موہن نمبالکر ___ کے کلرکوں نے حساب کتاب میں ایسی گڑبڑ کی کہ وہ روتا پیٹتا میرے پاس آیا، رجسٹر دیکھے تو روز اور ہم دونوں گھبرا گئے۔ برٹن کو پتہ چل جاتا تو مصیبت آجاتی۔ طے ہوا کہ کسی تجربہ کار شخص کی مدد لی جائے۔ جرجیس لاپرواسا تھا۔ چنانچہ میں منصور کے پاس گیا، وہ بڑے تپاک سے ملا، پوری بات سنے بغیر بولا ___ "کاغذات یہیں چھوڑ جایئے اگلے ہفتے تک سب کچھ درست کر دوں گا" ___ موہن سات راتیں جاگتا رہا، آٹھویں روز منصور نے خود آکر بتایا کہ حسابات درست ہو گئے ہیں۔

تب پتہ چلا کہ جسے ہم مغرور اور گستاخ غیر ملکی سمجھتے رہے تھے۔ وہ فقط خوددار تھا

اور نہایت نفیس انسان تھا۔ یہ سات راتیں اس نے جاگ کر گزاری تھیں۔

آخر وہ شبھ گھڑی آئی جس کا دیر سے انتظار تھا، برٹن سے اجازت لے کر ہم بغداد جا رہے تھے۔ آٹھویں صدی میں جب لندن اور پیرس چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے تب خلافت کا یہ دارالخلافہ دنیا کا سب سے بڑا شہر تھا، اس زمانے کا بغداد —— پھر الف لیلیٰ کا بغداد —— ہلاکو کا بغداد۔ پتہ نہیں اب کیسا ہوگا۔ کھجوروں کے جھنڈ آ گئے، عورتیں مٹی کے برتن لئے دجلے کی طرف آ رہی تھیں۔

دجلے کا پانی اور بھی گدلا ہو گیا —— بغداد قریب تھا۔ جب بغداد آیا تو کچھ بھی نہیں ہوا، عمارتیں، سبزہ، درخت —— ہر چیز پر ریت کی تہیں جمی ہوئی تھیں، بغداد کا دجلہ ایسا تھا جیسے چار بہہ رہی ہو —— دکانوں کی قطاریں تھیں، پارک تھے اور لوگوں کا ہجوم تھا —— شارع رشید دیکھ کر رسوائے عالم ابونواس کی سڑک پر پھرے، بغداد ہوٹل کے سامنے سے گزرے، ہر ساتویں آٹھویں بغدادی کے چہرے یا بازوؤں پر بغدادی ناسور دیکھا —— پھر دجلے کے کنارے پر آ کھڑے ہوئے ——

"یہ تو کچھ نہیں ہے —— " نمبالکر نے مایوس ہو کر کہا۔

"تھوڑا انتظار کرو —— رات ہو لے پھر دیکھنا —— " جرجیس نے بتایا۔

دجلے میں طرح طرح کی کشتیاں تیر رہی تھیں —— گول، لمبوتری، نوکدار، مستطیل نما، چند دخانی کشتیاں اور سٹیمر بھی نظر آئے —— اس سست رو بھورے سے دریا میں ایسی کیا بات ہے —— ؟ سوائے اس کے کہ صحرا میں بہتا ہے ——

بچپن میں پڑھی ہوئی کہانی یاد آ گئی —— صحرا کا دائمی پیاسا اور کھارے پانی کا عادی بدو بغداد آیا، کھانے کی قیمت چکا کر روٹی کے ٹکڑے کو دجلے کے پانی میں ڈبو کر چکھا، ایک روٹی کھائی، پھر دوسری، پھر تیسری —— جب آٹھویں پر پہنچا تو دکاندار نے جھنجلا کر پوچھا —— "بس بھی کرو۔ آخر کب تک کھاتے رہو گے؟"

"جب تک دجلہ بہتا رہے گا —— " بدو نے جواب دیا۔

—— سائے لمبے ہوگئے، سورج چھپ گیا اور بغداد چمکنے لگا —— دجلے کے کنارے روشن ہوگئے، پانی پر نور کا عکس پڑا تو جیسے آگ سی لگ گئی، موسیقی کی تانیں فضا میں مرتعش ہوئیں، قہقہے تھے، گہما گہمی تھی اور متعدد حسین چہرے —— راگ و رنگ کا طوفان آگیا —— دجلے کی سطح پر پھلجھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

جرجیس کی بُری حالت تھی، ابھی ساتھ ہے ابھی غائب ہوگیا، پھر آملا، ادھر جھانک رہا ہے ادھر تاڑ رہا ہے —— "وہ دیکھو ——" اس نے اشارہ کیا، ہم نے دریچے سے دیکھا۔ رقص ہو رہا تھا ایک طرف منصور بیٹھا تھا اور اُس کے ساتھ ایک شعلۂ جوالا، جو مچل رہی تھی، شرما رہی تھی، مسکراہٹیں بکھیر رہی تھی ——

"منصور بڑا خوش نصیب ہے ——"

"منصور یہاں رہ چکا ہے اور لوگوں کو جانتا ہے —— اگلی مرتبہ میں بھی کسی کے ساتھ ہوں گا —— اور تم سب دور سے دیکھ دیکھ کر رشک کروگے ——" جرجیس نے آہ بھری۔

ہم ایک ہوٹل میں بیٹھے کیبرے دیکھ رہے تھے۔

"ہائے یہ موسیقی کیسی اُداس کن ہے" نمبالکر نے آہ بھری۔

"وسکی میں پانی ملا رکھا ہے، چوتھے جام پر بھی کچھ نہیں ہوا ——" روز بھی غمگین ہوگیا۔

"برٹن یاد آرہا ہے بوڑھے کو ناحق وہیں چھوڑ آئے ——"

میں ماحول میں کھویا ہوا تھا کہ روز نے کندھا ہلا کر چونکا دیا —— "لنکی (Lanky) تم چپ کیوں ہو، کچھ کہو ——"

"ناحق رنگ میں بھنگ مت ڈالو —— یہاں سب مسکرا رہے ہیں اور تم منھ لٹکائے بیٹھے ہو —— جانتے نہیں یہ احساس تنہائی ہے ——"

"ہم تنہا تو نہیں، اکٹھے ہیں ——"

صبح کو دیکھا تو وہی مٹیالا سا دجلہ تھا اور وہی گرد سے اٹا ہوا بغداد۔ وہ حسن و جمال کہاں گیا؟ لطافتیں، خوشبوئیں کیا ہوئیں؟ موسیقی کی تانیں کہاں کھو گئیں؟ رات ہر شے سحر زدہ تھی۔ شاید الف لیلیٰ کے وقت کا طلسم اب تک باقی ہے۔ واپسی پر روز کہنے لگا کہ شہر تو میں نے کئی دیکھے ہیں لیکن دن رات کے سماں میں ایسا تضاد کہیں نہیں محسوس کیا ــــــ

میں ورزش کرتا تو وہ پوچھتے کہ اتنے کام کے بعد اس کی کیا ضرورت ہے؟ میں بتاتا کہ کام سے تھکاوٹ ہوتی ہے لیکن ورزش سے چستی آتی ہے۔

جرجیس کی طبیعت اچھی نہ ہوتی اور مجھ سے دوائی مانگتا تو میں ورزش تجویز کرتا ــــــ "بیزاری کا علاج ایک میل کی دوڑ جس کے بعد بیزاری یاد تک نہ رہے گی، بھوک نہ لگتی ہو تو ایک سو بیٹھکیں اور ایک میل کی دوڑ ــــــ زکام اور حبت اکٹھے ہوں تو؟" "بس بس بداخلاقی کی انتہا ہو گئی، میں مشورہ نہیں چاہتا ــــــ" جب کبھی باہر کا کام نکلتا تو جرجیس خاص طور پر میری سفارش کرتا ــــــ کہ اسے بھیجدو یہ بھاگا دوڑی میں خوش رہتا ہے۔

برٹن اُسے سمجھاتا ــــــ "جرجیس خدوخال تو قدرت تراشتی ہے لیکن جسم انسان خود تراشتا ہے اور پھر ورزش طرح طرح کی برائیوں سے محفوظ رکھتی ہے، نینگی کو دیکھو دن بھر کا تھکا ہارا شام کو شربت انار پی کر ایسا سوتا ہے کہ صبح کو بگل کی آواز بھی نہیں سنتا ــــــ"۔

ایک دن علی الصبح دوڑ لگائی تو منصور کے ماتحت نے پکڑ لیا۔ مجھے پہچان کر معافی مانگی ــــــ "واللہ یا ابو ریاضت یہ کیا حرکت ہے؟ صبح صبح اور مغرب کے وقت ایسی ورزش یہاں مت کیا کریں ورنہ لوگوں کو مغالطہ ہوگا کہ کوئی بدو کیمپ

میں چوری کرکے بھاگا جارہا ہے۔"

چوریوں کا ذکر اکثر ہوا کرتا، طرح طرح کے قصے بیان کیے جاتے، لوگ آپ بیتی سناتے۔ "یہاں یہ ہوتا ہے کہ کوئی سودا بیچنے والا پیچھے لگ جاتا ہے اجنبی انکار کرتا ہے معافی مانگتا ہے لیکن سودے والا تعاقب نہیں چھوڑتا۔ آخر اجنبی جھلّا اٹھتا ہے، جوں ہی تو تو میں میں شروع ہوئی کئی بیچ بچاؤ کرانے والے آجاتے ہیں جو صلح کراتے وقت اجنبی کو پیچھے دھکیلتے ہیں۔ تھپکی دیتے ہیں اور اسکا قلم، گھڑی اور بٹوہ غائب کر دیتے ہیں ــــــ"

"انھیں سفید چادروں کا بہت شوق ہے، کوئی سو رہا ہو تو چپکے سے بستر کے خالی حصّے کی نصف چادر تہہ کی جاتی ہے پھر ہری یا کسی ملائم چیز سے سونے والے کے گدگدی کی جاتی ہے۔ جوں ہی وہ کروٹ لیتا ہے بقیہ چادر نکال لی جاتی ہے ــــــ وہ صبح اٹھ کر ملازم کو ڈانٹتا ہے کہ چادر کیوں نہیں بچھائی۔ کبھی یقین تک نہیں آتا کہ لیٹے ہوئے انسان کے نیچے سے چادر نکل گئی۔"

"پہلی جنگ میں جب میں یہاں تھا تو عجب تماشا ہوا، ہر شام کو کیمپ سے ایک خچر غائب ہو جاتی ــــــ سنتریوں کی تعداد بڑھائی گئی پہرہ سخت کر دیا گیا، پھر بھی صبح کو اطلاع ملتی کہ ایک خچر کم ہے ــــــ آخر مخبروں نے چور پکڑوایا تو معلوم ہوا کہ جب شام کو جانور پانی پی کر واپس آتے تو چور کتّے کی کھال اوڑھ کر اُن کے ساتھ ساتھ کیمپ میں آگھستا اندھیرا ہو جانے پر ذرا ذرا سی دیر کے بعد خچروں کو چھیڑتا وہ ہنہناتیں دولتیاں جھاڑتیں فوراً سنتری آتا خچروں کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر واپس جاتا، پھر شور و غل مچتا، سنتری پھر بھاگ کر پہنچتا، خچروں کو صحیح سلامت پا کر لوٹ آتا، یہ عمل پانچ چھ مرتبہ دہرایا جاتا حتیٰ کہ سنتری خچروں سے اس قدر بیزار ہو جاتے کہ جب چور سچ مچ خچر کو لے کر بھاگتا تو وہ نہ ہنہنانے کی پرواہ کرتے نہ شور کی ــــــ"

"ایک مقامی باشندے کو آملیٹ بہت پسند تھا۔ اُس نے مجھ سے پکانے کی ترکیب پوچھی تو میں نے بتایا "پہلے چار انڈے چراؤ ــــــ پھر کچھ چرایا ہوا مکھن

لے کر ـــــ"

اور سب ہنسنے لگے۔

برٹن پرانا سپاہی تھا، اس کے تمغوں میں سے دو ایسے تھے جو فقط میدانِ جنگ میں دئے جاتے ہیں ـــــ میں نے پوچھا کہ آپ نے کیا کیا تھا؟ "یہ تمغے اُن معرکوں کی یاد ہیں، جن میں میرے رفیقوں کو جو مجھ سے کہیں دلیر اور فرض شناس تھے کچھ نہیں ملا، وہ مجھ سے زیادہ حقدار تھے ـــــ" پھر میں نے کبھی تمغوں کا ذکر نہیں کیا۔

ہمارے دو ساتھی تبادلے پر چلے گئے، لیکن اُن کی جگہ کوئی نہ آیا۔ اُس سے شکایت کی کہ کام زیادہ ہے۔ بولا "آدمی زیادہ ہونے سے کارکردگی کبھی نہیں بڑھتی، وہ سوال یاد ہوگا۔ جو بچے سے پوچھا گیا تھا کہ اگر دو آدمی ایک کام دو دن میں کرسکتے ہیں تو چار آدمی کتنے دن میں کریں گے؟ بچے نے جواب دیا تھا۔ چار دن میں۔ میرے خیال میں یہ جواب بالکل صحیح ہے آدمی جتنے زیادہ ہونگے اتنا ہی وقت ضائع کرینگے"۔

کیمپ کی بے کیف زندگی سے تنگ آجاتے تو وہ مشورہ دیتا ـــــ "اسی میں خوشیاں تلاش کرو، مسرت بھرے لمحے پروگرام کے تحت نہیں ملتے۔ یہ تو ادھر ادھر سے چرانے پڑتے ہیں۔ مسرتیں خوشبو دریاں باہر سے نہیں منگوائی جاتیں، یہ تو ڈھونڈی جاتی ہیں، بے کیفی اور یکسانیت کے تالاب سے خود کھینچ کر نکالنی پڑتی ہیں ـــــ"

ایک دن ہم نے پوچھا کہ آپ نے شادی کیوں نہیں کی ـــــ "شادی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جوانی جہاں گردی اور دنیا کے الجھیڑوں میں بیت گئی اس کے بعد خیال چھوڑ دیا۔ محبت! آہ محبت لفظ نوعمروں کے لئے ہے اس عمر میں ہر چیز خواہ مخواہ رنگین معلوم ہوتی ہے۔ ہر جذبے میں بے ساختگی ہوتی ہے اور خلوص۔ محبوب کی مسکراہٹ سے ہفتے خوشی خوشی گزر جاتے ہیں۔ کامل یقین ہوتا ہے کہ محبوب مہربان ہوگیا تو امتحان میں ضرور کامیابی ہوگی، مالی حالت بہتر ہوجائیگی۔ دوست دشمن سب قدر کرنے لگیں گے، اور اُس کی بے رُخی سے سب کچھ تہس نہس ہوجائے گا۔ آئرلینڈ کی وہ جھلمل جھلمل کرتی ندیاں، وہ لہلہاتے کھیت،

گھنے جنگل، شاداب گنج مجھے اب تک یاد ہیں۔ اگرچہ اُن لڑکیوں کے نام اور چہرے یاد نہیں رہے جواُن دنوں میرے ساتھ ہوا کرتیں، پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ کب بادل آئے تھے اور کب بوندیں تھم گیئں، طلوعِ آفتاب کے بعد اتنی جلدی چاند کیسے نکل آیا۔ ذرا دیر پہلے گھپ اندھیرا تھا دفعتاً یہ روشنی کہاں سے آگئی ـــــ ہائے وہ جگمگاتی صبحیں وہ رنگین شامیں ـــــ محبت کی اصلی عمر یہی ہوتی ہے اس کے بعد تو بس دکھاوا ہے"

ہم نے روز کو اشارہ کیا کہ یہی موقع ہے پوچھ لو ـــــ اُس نے ڈرتے ڈرتے بغداد کا ذکر کیا ـــــ بوڑھا ترنگ میں تھا کہنے لگا ـــــ "میں کام کے سلسلے میں سختی برتتا ہوں لیکن محبت کے معاملات میں دخل نہیں دیتا ـــــ چھٹی کے دن جوڑا بغداد جانا چاہے جا سکتا ہے ـــــ لیکن محتاط رہنا ان شہروں میں آئے دن فساد ہوتے ہیں۔ میں جنگ سے اتنا نہیں ڈرتا جتنا فسادات سے، لڑائی میں دشمن کی تمیز کی جا سکتی ہے لیکن جب ہجوم مشتعل ہو جائے تو دوست دشمن کا پتہ نہیں چلتا اور ایسی خبریں پڑھنے میں آئی ہیں ـــــ جنوبی افریقہ میں فساد ـــــ دو تماشائی جو جاپانی تھے ہلاک ہوئے یا منچوریا میں فساد تین فرانسیسی راہگیروں کی حالت نازک ہے۔ بطور تماشائی مرنا بے حد ہونق موت ہے ـــــ"

ہم بغداد جانے لگے، سنیچر کی شام کو بغداد پہنچ کر خوش ہوئے اور اتوار کی شام کو واپس کیمپ آکر بھی اتنی ہی خوشی ہوئی ـــــ کیوں کہ شہر میں چور اور دوکان دار ہماری جیبیں خالی کر دیتے۔

برٹن اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کے ذکر سے ہمیشہ احتراز کرتا اُدھر جرجیس کا محبوب موضوع ہی یہی تھا اپنے اور دوسروں کے تایوں، چچوں، بھائی بھتیجوں کے متعلق بتاتا اور پوچھتا۔ اُسے سمجھایا بھی کہ انگریز ایسی باتوں میں دلچسپی نہیں لیتے لیکن پھر بھی برٹن سے پوچھ بیٹھا ـــــ "آپ کے کتنے بھائی ہیں؟"

"ایک ہے ـــــ لیزلی ـــــ بڑا بدذات ہے، ہم دونوں گہرے دوست

بھی ہیں ـــــ ۱۹۳۳ء میں وہ لندن میں تھا' اب نہ جانے کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے ؟"

"تو آپ دس سال سے نہیں ملے ؟" جرجیس نے ایک اور غلطی کی۔

"در اصل ہم ۱۹۲۲ء میں ملے تھے، پھر گیارہ سال کے بعد میں چھٹی پر گیا، لندن میں کسی نے بتایا کہ لیزلی بھی وہیں ہے' کھوج نکال کر اُس کے فلیٹ پر پہنچا ـــــ آواز دی ـــــ لیزلی ! لیزلی !! ـــــ کون ہے ؟ وہ اندر سے چلّایا ـــــ میں ہوں ایرک مشرق وسطی کا کیا حال ہے ؟ ـــــ اچھا ہے کوئی تازہ خبر سناؤ ـــــ پوس ٹیس کا انتقال ہوگیا ایرک ـــــ کیسے ہوا لیزلی ؟ ـــــ وہ چلا جا رہا تھا ٹرام سے گر کر مر گیا' تمھیں تعجب ہوا ایرک ؟ ـــــ نہیں لیزلی ! اس کی صحت گرتی جا رہی تھی' جب وہ سکندریہ میں ملا تو میں نے صاف صاف بتایا تھا کہ اولڈ بک تم زرد ہوتے جا رہے ہو تمھارا وقت قریب ہے۔ پتہ نہیں ہمارے پرانے دوست نے یہ چار سال کیسے نکال لئے' اور لیزلی تم باہر نکلو نا ـــــ ایرک مجھے کچھ دیر لگے گی میں باتھ روم میں حجامت کر رہا ہوں انتظار کرو ـــــ میں انتظار نہیں کر سکتا لیزلی آدھ گھنٹے میں مجھے پکاڈلی سرکس پہنچنا ہے ـــــ پھر تو ایرک تم فوراً بس پکڑ لو ورنہ لیٹ ہو جاؤ گے پھر کبھی ملیں گے گڈ بائی ـــــ چیرز لیزلی ـــــ اگلے روز اُسے فون کیا وہ کہیں باہر جا رہا تھا' اُس نے فون کیا میں ہوٹل میں نہیں تھا ـــــ پھر میں نے کیا تو بولا گھڑ دوڑ پر جا رہا ہوں چلو گے ـــــ مجھے گھڑ دوڑ سے اب دلچسپی نہیں رہی چنانچہ میں نہیں گیا۔ اگلے ہفتے وہ سمندر کے کنارے چلا گیا۔ میں بھی مصروف رہا۔ اتنے میں چھٹی ختم ہو گئی اور میں واپس آگیا، لیزلی سے ملاقات ہو جاتی تو اُسے آئر لینڈ چلنے کے لئے مجبور کرتا، گھر ہو آتے اور یہ بھی دیکھ آتے کہ اولڈ مین کا موڈ کیسا ہے ـــــ"

جرجیس حیران رہ گیا ـــــ "اور پوچھو انگریزوں سے ایسے سوال" ـــــ نمبالکر نے ڈانٹا۔

موہن نمبالکر مرہٹا تھا' سانولا رنگ' پستہ قد گٹھا ہوا جسم' بڑی بڑی آنکھیں

بلا کی چمک تھی۔ کبھی نچلا نہ بیٹھتا' دن بھر کچھ نہ کچھ کرتا رہتا۔ تبھی برٹن نے اس کا نام نمبل (Nimble) رکھا تھا۔ اس کا خیمہ میرے پڑوس میں تھا' علی الصبح ہولے ہولے 'تم جاگو موہن پیارے' گاتا جیسے اپنے آپ کو جگا رہا ہو۔ پھر اٹھ کر دجلے کے کنارے سے طلوع آفتاب دیکھتا ——— کبھی کبھی ——— 'کرلے اس دن کی تدبیر جب تیرا آئے گا پروانہ' ——— اور جوگیوں کے دوسرے گیت 'مارے مارے پھرتے ہیں دن بھی ہمارے پھرتے ہیں۔ گاتا' میں ورزش ختم کرتا تو دریا کے کنارے ملاقات ہوتی' "خان صاحب کیسی سہانی صبح ہے' دریا میں سونا بہہ رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم مغربی کنارے پر ہیں ورنہ طلوع آفتاب نہ دیکھ سکتے" ——— اُدھر برٹن اور روز وغیرہ غروب آفتاب پر فدا تھے — سورج کا ڈوبنا اُداس سا نظارہ ہے۔ لیکن طلوع تخلیق کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔ "میرا عقیدہ ہے کہ اگر انسان صبح صبح مسرور ہو تو سارا دن اچھا گزرتا ہے۔ میں نے تو آج تک شام کا انتظار نہیں کیا۔" مشقت کے علاوہ اسے فقط دو چیزوں کا شوق تھا' موسیقی اور کبھی کبھی ذرا سی وہسکی۔

"جوگیا نری عبادت ہے خان صاحب۔ انسان پہاڑ کی چوٹی اور سمندر کی تہہ ناپ سکتا ہے لیکن درباری کی وسعتوں کا اندازہ نہیں لگا سکتا' جس شام کو وہسکی نہ ملے ایمن سے نشہ پورا ہو جاتا ہے ——— دوسری ملہاروں اور میاں کی ملہار میں آپ نے فرق محسوس کیا؟ اُستاد نے ذرا سی تعلیم واضافے سے سماں باندھ دیا اُسے سنتے وقت بارش کی پھواروں اور جھینگروں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں' بھیگے بھیگے جھونکوں کا لمس محسوس ہوتا ہے' انسان کتنا ہی اُداس ہو آساوری کی چند تانیں سب کچھ بھلا دیتی ہیں ———

"میں نے تیس برس تک نہ کبھی غم لگایا نہ شراب کو چھوا' پھر والد کا انتقال ہو گیا' شمشان بھومی میں انھیں جلانے کے فرائض بطور بڑے بیٹے کے مجھ کو سرانجام دینے پڑے' اس دن جو کچھ مجھ پر بیتی بیان نہیں کر سکتا' شام کو میں نے پہلی مرتبہ پی۔ اس واقعہ کو دس سال گزر چکے ہیں لیکن مجھے وہ دن نہیں بھولا ——— خان صاحب میں نے عجیب عجیب محفلوں میں پی ہے' بلچوں' شہدوں لفنگوں جہاں گلاسوں کی جگہ بوتلوں سے حساب ہوتا تھا بات

بات پر چا تو نکل آتے تھے۔ (اس کے ماتھے پر زخم کا لمبا سا نشان تھا) یہ زخم ان خرمستیوں کی یادگار ہے' جب مہاراجہ کی ملازمت میں تھا تو کئی مرتبہ پری جالوں کے جھرمٹ میں راجہ اندر کی طرح بیٹھ کر پی —— ایک ایک حسینہ ایسی تھی کہ اس کے لئے عمر گنوا دی جائے اور ذرا افسوس نہ ہو' کچھ شراب کا نشہ' کچھ ان متوالی آنکھوں کا خمار' کیا کیا کیفیتیں طاری ہوتی تھیں اب یوں لگتا ہے جیسے ایک سہانا خواب دیکھا تھا۔ ایسے ایسے منحوس مطلب پرست خبیثوں کا بھی ساتھ دیا کہ گھنٹوں کی بادہ نوشی کے بعد بجائے سرور کے افسردگی ملی اور توبہ کرنے کو جی چاہا —— شدید صدمے برداشت کرنے کے لئے پی اور ہمیشہ صدمے کو شدید تر پایا' شرط لگا کر بھی پی' بلا نوشوں سے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ لیکن اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اگر ہر وقت کسی کام میں لگا رہوں' موسیقی کا شوق پورا ہوتا رہے اور شام کو ذرا سی چسکی لگ سکے تو مجھے اور کچھ نہیں چاہئے ——"

اس کی ازدواجی زندگی خوش گوار نہیں تھی۔ بیوی ہمیشہ اپنے نکھٹو باپ کے پاس رہتی کبھی کبھی اس کے پاس آتی تو غربت کے طعنے دیتی' لڑنے کے بہانے تلاش کرتی —— یہ کہانی اور اپنی زندگی کی دوسری الم ناک کہانیاں دہرا کر وہ پوچھتا —— "دنیا میں کسی چیز کو بھی ثبات نہیں' دوست بنانے میں مدت لگتی ہے لیکن کسی چھوٹی سی بات سے برسوں پرانی دوستی یوں ختم ہو جاتی ہے۔ یہاں ہمیشہ ڈر ڈر کر کیوں رہنا پڑتا ہے' کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جو آج محبوب بنا ہوا ہے اس کے دل میں کل بھی اتنی ہی محبت ہوگی —— ذرا سی جدائی' معمولی سی غلط فہمی' تخیل کی غلط پرواز' شب و روز کی یکسانیت' کسی تیسرے کی آمد —— بعض اوقات تو کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی اور آناً فاناً میں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے —— یہ کیا تماشا ہے؟"

میری خاموشی پر دوبارہ پوچھتا —— "بتائیے نا ——"

لیکن میں کچھ نہ کہتا —— آخر وہ مایوس ہو کر شکایت کرتا —— "آپ جان بوجھ کر ٹال جاتے ہیں ——" اس کا رنگ سانولا تھا لیکن جب گوروں کالوں پر بحث

ہوتی تو وہ غیر جانب دار رہتا ——— "دجلہ کے دونوں رنگ پیانو کے سفید و سیاہ پردوں کی طرح ہیں۔ جب تک دونوں ہم آہنگ نہ ہوں نغمہ پیدا نہیں ہوتا ———"

برٹن اس سے کہا کرتا ——— "دیوتاؤں کے سامنے موسیقی رقص اور پھولوں کی پیشکش سے اپنی عقیدت کا اظہار کرنا کس قدر خوشگوار ہوتا ہوگا ——— مجھے تمھارا طرزِ عبادت بہت پسند ہے ———"

کیمپ میں ایک گھنی مونچھوں والا چڑچڑا شخص تھا جس سے سب نفرت کرتے تھے ——— موہن اسے بھی ناپسند نہیں کرتا تھا ——— "یہ برا آدمی نہیں ہے کیوں کہ اسے گانے کا شوق ہے۔" حالانکہ وہ رات کے گیارہ بارہ بجے بھیانک آواز میں ایسے بے سُرے گانے گایا کرتا تھا، کہ سب نالاں تھے آخر تنگ آکر منصور نے سب کے سامنے اُسے بتایا کہ "حکیم رازی کو جوانی میں بانسری بجانے اور گانے کا بڑا شوق تھا۔ جب پختگی آئی تو گانا بجانا یکلخت ترک کر دیا اور فرمایا کہ جو موسیقی داڑھی اور مونچھوں کے درمیان سے نکلے اس میں کوئی جاذبیت نہیں ہوتی۔" منصور کی نصیحت کارگر ثابت ہوئی۔

موہن کا خیال تھا کہ جب دنیا کے باشندوں میں موسیقی کو سمجھنے اور اس سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی تب کوئی کسی سے نہیں لڑے گا۔

جرجیس کا اصل نام جارجز تھا اور اصلی وطن آرمینیا۔ موٹا تازہ آرام طلب نوجوان تھا۔ پتہ نہیں نوکری کیوں کر رہا تھا کیوں کہ اسے کام سے نفرت تھی، قواعد و ضوابط سے چڑتا تھا، پیدل چلنے سے گریز کرتا ——— "میں سویلین ہوں مجھے کچھ نہ کہو" کہہ کر بیماری کے بہانے سے خیمے میں لیٹ جاتا۔ دائمی کاہلی کے باوجود جرجیس نہایت شدید قسم کا عاشق تھا اور تقریباً ڈیڑھ یا پونے دو عاشقوں کے برابر تھا۔ کسی لڑکی کو مغموم دیکھ کر اس سے رہا نہیں جاتا تھا دراصل جو لڑکی مغموم نہ بھی ہو اُسے دیکھ کر بھی بے قابو ہو جاتا۔

چنانچہ ہمیشہ وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی پر عاشق رہتا تھا۔ اور بات تھی کہ کبھی لڑکی کا نام اٹھ لیا ہوتا، کبھی لوریتا تو کبھی روزاریا۔ ساتھ ساتھ یہ گلہ بھی رہتا کہ اسے اتنی توجہ نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہے —— آج وہ ناروزانے سلام کا جواب نہیں دیا، ہنریٹا نے دیکھتے ہی منہ پھیر لیا۔ باتیں تو ہوئیں لیکن پھیکی پھیکی سی —— اور توا اور وہ بے وقوف میریا بھی روٹھی ہوئی ہے مسکراتی تک نہیں —— "ہائے ہمیں زندگی سے کچھ بھی تو نہیں ملا ——"

"اور تم نے زندگی کو کیا دیا ہے؟" روز چڑ کر کہتا —— "تم ان لوگوں میں سے ہو جو ہر وقت ہر قسم کی توجہ کے طالب رہتے ہیں جنھیں وبا سے بچ جانے پر خوشی کی جگہ افسوس ہوتا ہے کہ وبا نے جان بوجھ کر نظر انداز کیا ہے" —— روز اور جرجیس کی ہمیشہ ٹھنی رہتی ——

"جرجیس کائنات میں تقریباً دس کروڑ جھرمٹ ہیں ہر جھرمٹ میں دس لاکھ کے قریب نظام شمسی ہیں، ہر نظام میں بے شمار سیارے ہیں جن میں سے کچھ آباد بھی ہوں گے، ادھر تم ہو کہ ایک چھوٹے سے سیارے کے ننھے سے ملک کی ذرا ذرا سی باتوں میں غلطاں رہتے ہو ——"

"جو چیز دوربینوں سے نہ دکھائی دیتی ہو اُس پر میرا کوئی اعتقاد نہیں —— دنیا کا جو اتنا سا حصہ نظر آتا ہے اسی پر قانع ہوں خاص طور پر بغداد، یہودنوں والا پل بڑی پرکشش جگہ تھی —— شام ہوتے ہی گہما گہمی شروع ہو جاتی، کنارے خالی ہیں اور ساری رونق پل پر سمٹ آتی ہے، چہل قدمی کرتے ہوئے کسی نے رومال گرا دیا کہ کوئی اٹھا کر دے تو تعارف ہو، گھڑی ہوتے ہوئے کسی سے صحیح وقت پوچھنا، سرخ ہونٹوں میں سگریٹ دبا کر کسی سے ماچس مانگنا۔ اسی قسم کے سینکڑوں حربے۔ سیاہ زلفیں، زیتونی رنگ، بھرے بھرے ہونٹ، چست لباس اور بڑی بڑی آنکھیں۔

جرجیس بار بار کہتا کہ یہودی تو کچھ نہیں مگر یہودنیں (چٹکی بجا کر) واللہ! اس کے باوجود یہ یہودنیں جرجیس کے لئے سرکس کے جانوروں کی طرح تھیں، وہ انھیں بڑے شوق سے دیکھتا بار بار ملنا چاہتا لیکن ان میں سے کسی ایک کے ساتھ زندگی

گزارنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے ——— ؟" روز تنگ آکر پوچھتا۔

"شادی کر لی تو اپنی شامیں کہاں گزاروں گا ؟"

"شادی سے نفرت کرتے ہو ؟"

"جی نہیں ! میرے خیال میں شادی شدہ لوگوں کے لیے بہت اچھی چیز ہے ———"

"تو عورت کی مستقل رفاقت سے ڈرتے ہو ؟"

"ایک عورت کی رفاقت تو ٹھیک ہے لیکن جو باقیماندہ اتنی ساری عورتوں سے دور رہنا پڑتا ہے۔ یہ بہت مشکل ہے، یہ کیمپ تو اتنا بڑا نہیں ہے، اس سے پہلے میں جہاں تھا وہاں اتنی تنہائی تھی کہ شادی کرتے کرتے بال بال بچا ———"

میں اُسے بتاتا کہ تمھاری تکنیک بالکل غلط ہے ——— اور تم پر سے

نہ آیا ہمیں عشق کرنا نہ آیا

مرے عمر بھر اور مرنا نہ آیا

والا شعر عائد آتا ہے ——— ملتے ہی لڑکیوں کو خفا کر دیتے ہو ———

"یہ تو دل کے معاملے ہیں جو سوجھتی ہے کہہ دیتا ہوں، قوانین وضوابط سے مجھے سدا کی چڑ ہے ———"

جمر جبین کی تکنیک یہ تھی ———

کوئی حسین لڑکی کہتی ——— "آج میری سالگرہ ہے۔"

"مبارک ہو، آج آپ کتنے سال کی ہوئیں۔"

یا "چلو سینما چلیں ——— ہائے تمھیں سینما پسند کیوں نہیں ؟"

"مجھے ٹاکیز سے پہلے کی خاموش فلمیں پسند تھیں ان میں یہ جاذبیت تھی کہ عورتوں کے ہونٹ ہلتے تھے لیکن کانوں کو کچھ سنائی نہیں دیتا تھا ———"

"بڑے بدتمیز ہو، تمھارے متعلق میں سب جانتی ہوں کہ تم جھوٹے ہو، ہرجائی اور لفنگے بھی ہو۔"

"سوچ لو! تم مجھے ترغیب دلا رہی ہو ——"

ظاہر ہے کہ اس قسم کی باتوں سے کوئی لڑکی مرعوب نہ ہوتی۔ لیکن جرجیس کا جوش و خروش کسی طرح کم نہ ہوتا، ایک پختہ عمر کی خاتون سے فلرٹ کرتے وقت یہ فقرہ سُنا ——

"جانتے ہو میں تمھارے دوست کی چچی ہوں؟"

"چچی جان آپکی آنکھوں میں بلا کی کشش ہے ——"

"تمھیں مجھ سے ملنے کی جرات کیونکر ہوئی ——؟"

"ساتھیوں کے ساتھ بابل، ٹیسیفون اور دوسرے آثارِ قدیمہ دیکھنے آیا تھا، سوچا کہ آپ سے بھی مل لوں۔"

"آیندہ مجھ سے دور رہنا، تمھارے اور میرے خیالات مختلف ہیں ——"

"واقعی ہم دونوں مختلف ہیں، تمھیں لڑکے پسند ہیں اور مجھے لڑکیاں ——"

کام کے اوقات ختم ہوتے ہی جرجیس یکلخت چت ہوجاتا، خیمے میں آتا تو جیسے زلزلہ آجاتا۔

"چپ کیوں ہو، ریڈیو لگاؤ، گراموفون بجاؤ، شور مچاؤ اور کچھ نہیں تو تاش ہی کھیلو، یارو کچھ تو کرو! توبہ توبہ کیسے سست الوجود دوستوں سے واسطہ پڑا ہے، زندگی تباہ ہوگئی ہے۔" پھر دفعتاً اداس ہوجاتا اپنی ناکامیوں کے قصے لے بیٹھتا" جو بے شمار تھے، آخر میں مسکرا کر کہتا۔

"دیکھ لینا دوست! کسی نہ کسی روز میرا نصیبہ ضرور جاگے گا، حالات خود بخود سازگار ہوتے چلے جائیں گے، جس کام میں ہاتھ ڈالوں گا کامیابی ہوگی، یکے بعد دیگرے خوشخبریاں آئیں گی، میری جیبیں پُر ہو جائیں گی اور ہر شام کو بغداد جا سکوں گا۔ دوسروں سے قرض مانگنے کے بجائے انھیں ادھار دیا کروں گا، دوست میری قابلیت کا اعتراف کیا کرینگے

وہ وقت دور نہیں ہے ـــــ"

آخر ایک روز برٹن نے جر جیس کو ڈانٹ دیا ـــــ "یہ تم ہر وقت لڑکیوں کے پیچھے لگے رہتے ہو۔ دنیا میں اور کام بھی تو ہیں ـــــ"

"جناب لڑکیوں سے نہ ملا جائے تو ان سے محبت کیوں کر ہو، محبت نہ کی جائے، تو ناکامی کیسے ہو اور محبت کی ناکامی کے بغیر غم غلط کرنے کے موقعے کس طرح ملیں ـــــ؟"

اس نے جام خالی کرتے ہوئے جواب دیا۔

رونڈ پکا ریاضی داں تھا بات بات پر سوال نکالنے بیٹھ جاتا، بغداد جانے سے پہلے یہ پوچھا کہ بل ادا کرنے کا کام کس کے سپرد کیا جائے پھر سب سے برابر چندہ لے کر اس کے حوالے کرتا ـــــ "جب وہ نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ دیکھیں گے تو ہم سب کو امیر سمجھیں گے ـــــ دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اپنی جیب کی حفاظت نہیں کرنی پڑے گی۔" وہ بالکل گنجا تھا اپنی مدافعت میں طرح طرح مثالیں پیش کرتا ـــــ "چارلس دوئم گنجا تھا، موسم گرما میں سر کے مصنوعی بال اتار کر ٹہل رہا تھا کہ ملکہ نے دیکھ لیا، اس کی چیخ سن کر بولا۔ جانِ من کیا کروں گرمی بہت ہے۔ فرانس کے لوئی چہار دہم نے عمر بھر اپنے گنجے پن کو چھپائے رکھا، فرانسیسی بہت سی باتیں چھپا لیتے ہیں۔ ملکہ الزبتھ گنجی ہوئی تو محل اور دربار کے سارے آئینے تڑوا دیئے سکاٹ لینڈ کی ملکہ میری اور فرانس کی میری انتونینٹ دونوں گنجی تھیں لیکن یہ راز ان کی موت کے بعد کھلا میں تو معمولی سا انسان ہوں، گنجا ہوں تو بس گنجا ہوں چھپاتا تو نہیں۔"

اس کی سالگرہ کی پارٹیاں مشہور ہو چکی تھیں۔ کوئی لڑکی گھر جانا چاہتی ہو تو روز فوراً اعلان کر دیتا کہ آج تو اس کی سالگرہ ہے جلد گھر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی بار بار بلانے پر نہ آئی تو پیغام بھیجتا ـــــ آج وطن میں عزیز و اقارب میری سالگرہ منا رہے ہوں گے۔ میں یہاں بے یار و مددگار ہوں کم از کم آج تو مایوس نہ کیجئے غرضیکہ ہر دوسرے ہفتے یہ مبارک دن آ جاتا لڑکیوں کو مدعو کرتے وقت بھی وہ فارمولے

استعمال کرتا" ـــــ "پیر کو میرے ساتھ چائے پیجئے" ـــــ "پیر کو میری دادی آرہی ہیں" وہ کہتی ـــــ اگلے روز پھر ٹیلیفون کرتا ـــــ "اچھا تو بدھ کی شام کو رقص پر چلیں؟" بدھ کو میں مصروف ہوں"۔ ـــــ "تو پھر جمعرات کو؟" پر انتظار کروں جب تین چار مرتبہ انکار کرکے آخر وہ سنیچر یا اتوار کے لئے مان جاتی۔ روز بڑی سنجیدگی سے مجھے سمجھاتا "لڑکی کے چار پانچ انکار برداشت کرنے چاہئیں پھر اسے مجبوراً ہاں کہنی پڑتی ہے، سنیچر اتوار کے پروگرام مجھے موافق کرتے ہیں۔ اس لئے پیر سے پوچھنا شروع کردیتا ہوں، لیکن اگر کسی اور دن کا پروگرام بنانا ہو تو اس کے مطابق ردّوبدل کرنی ہوگی" ـــــ

وہ ہمیں حساب لگاکر بتاتا کہ جن پہاڑوں سے دجلہ نکلتا ہے وہ فرات کے پہاڑوں سے نیچے ہیں لہٰذا ان کی برف پہلے پگھلتی ہے پہلے دجلے میں سیلاب آتا ہے پھر فرات میں اور دونوں دریا سال میں پینتالیس لاکھ ٹن مٹی بہاکر لاتے ہیں" ـــــ

"اور جو پینتالیس لاکھ ایک ٹن یا چوالیس لاکھ ننانوے ہزار نوسو ٹن لاتے ہوں پھر؟" ہم پوچھتے ـــــ

"دجلے کی رفتار دوسرے دریاؤں کے مقابلے میں کافی سست ہے اور فرات تو بالکل ہی آہستہ چلتا ہے ـــــ" کسی رسالے میں آزاد نظم یا جدید آرٹ کی تصویر دیکھتا تو سوچنے لگتا پھر غالباً انہیں پرکار اور پیمانے سے ناپتا ـــــ "مصرعوں کی لمبائی درست نہیں ہے خطوط اور کمپوزیشن میں بھی یہی نقص ہے نظم نثر معلوم ہوتی ہے اور تصویر میں کچھ دکھائی نہیں دیتا ـــــ میرے خیال میں یہ لوگ میرے اور آپ کے لئے شاعری یا مصوری نہیں کرتے بلکہ صرف ایک دوسرے کے لئے کرتے ہیں"

کوئی کسی ناخوشگوار واقعے سے افسردہ ہو جاتا یا غم لگا لیتا تو روز خفا ہو کر کہتا ـــــ "ایسا واقعہ تین دن یا زیادہ سے زیادہ پانچ دن تک بھلا دینا چاہئے۔ رہ گیا یہ فکر کہ لوگ کیا کہیں گے، لوگوں کو اپنی پڑی رہتی ہے، اس معاملے میں پبلک کا حافظہ بعید کمزور ہے لہٰذا بہترین فارمولا یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر انسان اپنے آپ سے یہ سوال

پوچھے کہ آج سے تین مہینے کے بعد آج کا واقعہ یاد رہے گا؟ اور اگر رہا بھی تو میری نظروں میں اس کی اہمیت ہو گی؟"

منصور سب میں کم گو تھا۔ الگ تھلگ رہتا، بغداد میں اکیلا جاتا، ہر مرتبہ اس کے ساتھ کوئی نئی حسینہ ہوتی لیکن محفلوں میں کبھی کسی لڑکی کا ذکر اس کے ہونٹوں پر نہیں آیا، اس کی باتوں سے ہم فقط اتنا اندازہ لگا سکے کہ ایک تو اسے میدان کے باشندے اچھے نہیں لگتے اور دوسرے اُسے شکار اور گھوڑے کی سواری کا بہت شوق ہے اور اپنے وطن کی پہاڑیاں بہت عزیز ہیں۔

"میدان کے شہریوں کی دوستی ان افیمیوں کی دوستی کی طرح ہے جو پینک میں چلے جا رہے تھے کہ ایک کنوئیں میں گر پڑا، دوسرے کو جب تنہائی کا احساس ہوا تو نعرہ لگایا۔ دوست کہاں ہو؟ ــــ کنوئیں میں ہوں ــــ جواب ملا۔ اچھا دوست ہماری تو یہ دعا ہے کہ جہاں رہو خوش رہو ــــ یہ کہہ کر چلتا بنا ــــ"

"سب سے دلکش اور روح پرور وہ ہوا ہے جو گھوڑے کے کانوں کے بیچ میں سے گزر کر آتی ہے۔" وہ کہتا اسے اپنے گھوڑے سے اتنی محبت تھی کہ کیمپ کی موٹروں لاریوں کے باوجود گھوڑے کو ساتھ رکھتا، اس کا ذکر اس طرح کرتا جیسے کسی دوست کی باتیں سنا رہا ہو ــــ "اگر قصور پر سزا دو تو بیچارہ چپ چاپ برداشت کر لیتا ہے لیکن بلاوجہ ڈانٹ دو تو روٹھ جاتا ہے اور کئی کئی دن چارہ نہیں کھاتا۔ اس کی ماں ہمارے گھر میں رہتی ہے اس سے کوئی کام نہیں لیتے۔ اس کی اتنی ہی عزت کی جاتی ہے جتنی کنبے کی بڑی بوڑھیوں کی ہوتی ہے" ــــ اور مجھے اپنے وطن کے گھوڑے یاد آ جاتے ان کی زبوں حالی پر افسوس ہوتا کہ آٹھ آٹھ موٹی تازی سواریاں بٹھا کر تانگے والے ہر دو تین منٹ کے بعد عادتاً چابک رسید کر دیتے ہیں،

ایک روز میں نے عربی سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"اتنے دن ہو گئے ہیں کچھ تو سمجھ لیتے ہو گے"، منصور بولا۔

"فقط گنے گنائے الفاظ آتے ہیں لیکن ان کی گردان بہت مشکل ہے ——"

"شہروں میں تقیل، قتلو تقتل، قتلت، یقتون —— کے الفاظ تو بار بار سنے ہوں گے"

"میں نے بھی سنے ہیں"، رَوز نے کہا۔

"بس یہ قتل کی گردان ہے جو شہروں میں اکثر ہوتی رہتی ہے —— اسی سے گرامر سیکھنے کی کوشش کرو۔"

برٹن کے ساتھ موٹر میں ہرن کا شکار کھیلنے گئے۔ اتفاق سے جو موٹریں ہمیں ملی ہوئی تھیں ان سے صحرائی ہرن تیز دوڑتا تھا (رَوز نے حساب لگا کر بتایا کہ پانچ میل فی گھنٹہ کا فرق ہے) اس قسم کا شکار مجھے اچھا نہیں لگا۔ میں نے رَوز سے کہا کہ اس سے بہتر تو یہ ہوگا کہ ہم ہرن کو دستی بم یا ہوائی جہاز سے ہلاک کر لیا کریں —— منصور نے موٹر سے ایک فائر بھی نہیں کیا۔ شکار کو بچکر نکل جانے کا پورا موقعہ ملنا چاہیئے —— وہ دہراتا رہا —— پھر ہم دونوں گھوڑوں پر شکار کھیلنے نکلے —— اس نے کردستان کی پہاڑیوں کے جانوروں، پرندوں کی باتیں بتائیں، شکار کے قصے سناتے وقت اس کی آنکھیں چمکنے لگتیں —— "گھوم کر آتی ہوئی مرغابی، پتھر کی طرح گرتا ہوا پرندہ، لڑکھڑاتا ہوا ہرن —— کوئی اور نظارہ بھی اتنا حسین ہو سکتا ہے؟"

ہم دونوں لمبی سیر پر نکل جاتے، آبادی سے دور نکلتے ہی وہ لمبا سانس لے کر ہوا کو سونگھتا —— "اب ویرانے کی ہوا آتی ہے اس کی تازگی تم نے بھی محسوس کی ہو گی، لوگ تنہائی اور ویرانی کا رونا روتے رہتے ہیں یہ نہیں سوچتے کہ انسان کے آنے سے پہلے دُنیا اجاڑ ہی تو تھی، ساری گہما گہمی اور چہل پہل اسی کے دم سے ہے۔ مرد

جس جگہ خیمہ گاڑ دے وہیں رونق ہو جاتی ہے۔

"شاید تمھیں میری باتیں عجیب معلوم ہوتی ہوں، دراصل اس وقت پڑھا لکھا منصور نہیں بول رہا، دیہاتی کرد تم سے مخاطب ہے ـــــ زندگی میں عجیب عجیب لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے، ترشی، بدکلامی اور دنگے فساد سے مجھے نفرت ہے لیکن بعض اوقات کوئی ایسا خبیث بھی سامنے آ کھڑا ہوتا ہے جو فطرتاً بدگو، بدخو اور بدکردار ہوتا ہے، ایسے موقعوں پر انسانیت اور شرافت کے درس دینا نری بزدلی ہے اس سے اسی زبان میں گفتگو کرنی چاہیئے جسے وہ سمجھ سکتا ہو اور ایسا سبق سکھانا چاہیئے کہ عمر بھر نہ بھولے ـــــ"

میں نے ان حسین لڑکیوں کے متعلق پوچھا جن سے وہ بغداد میں ملا کرتا ـــــ

"ہاں کئی ہیں۔" وہ مسکرانے لگا

"کوئی منتخب کی؟"

"ابھی تک نہیں چن سکا، دیر تک کنوارے رہنے میں یہی خرابی ہے، جب شوخ و شنگ موسیقی سنتا ہوں تو چنچل سلامہ یاد آتی ہے جس کی موجودگی راگ رنگ کو سہ آتشہ بنا دیتی ہے پھیکی مٹیالی سی سہ پہر کو حزن کا مجسمہ سلمٰی سے ملنے کو جی چاہتا ہے جب بے کیف فضا پر یوں چھا جاتی ہے کہ آنسو نکل آتے ہیں، بذلہ سنجی میں ناصرہ کا کوئی جواب نہیں، جب محض خرافات بکنی ہو تو نوریہ جیسا رفیق ملنا مشکل ہے، زندگی کے اداس لمحوں میں جی چاہتا ہے کہ پر لگا کر منیرہ کے پاس پہنچ جاؤں دلجوئی کرنا کوئی اس سے سیکھے ـــــ بہت سے منصوبے باندھ لئے ہوں یا اپنے متعلق غلط فہمی ہونے لگی ہو تو مجیدہ کی تمکنت اور حسن بے پناہ کے سامنے سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے خود پسندی اور انا کا بھوت اترتے دیر نہیں لگتی ـــــ اچھی چیزیں کھائے ہوئے عرصہ گزر چکا ہو تو مستورہ بھلائے نہیں بھولتی ـــــ بتاؤ میں کیا کروں؟ اتنی ساری خوبیاں ایک لڑکی میں کیوں کر اکٹھی ہو سکتی ہیں؟!"

سنیچر کی رات تھی ہم رقص گاہ میں بیٹھے موسیقی سن رہے تھے، ایک لڑکی قریب سے گزری جرجبیس نے اسے ٹھہرالیا ۔۔۔ "معاف کیجئے آپ کی میز پر وہ خوبصورت سی لڑکی کون تھی؟"

"میں ۔۔۔" اس نے جواب دیا۔

"مگر اس کے رخسار پر تو تِل تھا ۔۔۔"

"میرے کا تِل تھا رومال سے اتر گیا ہوگا ۔۔۔ فرمایئے!"

"میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے ۔۔۔ شاید ملا بھی ہوں ۔۔۔"

"آپ نے مجھے دیکھا ہوگا لیکن میں آپ کو نہیں جانتی کیونکہ ابھی ابھی بغداد آئی ہوں"

"لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ۔۔۔"

"اب آپ کہیں گے کہ میری شکل جانی پہچانی سی ہے، میں آپ کو خوابوں میں نظر آتی ہوں، یا آپ کو مدّت سے میرا انتظار رہا ہے ۔۔۔" وہ آناً فاناً میں غائب ہوگئی۔

جرجبیس بہت خفا ہوا ۔۔۔ "میں نے دیکھا کسی اور کو تھا لیکن اب اس پر عاشق ہو کر نہ دکھایا تو نام جرجبیس نہیں ۔۔۔"

وہی لڑکی پھر سامنے سے گزری، جرجبیس کی طرف دیکھا تک نہیں ۔۔۔ وہ کچھ دیر تلملاتا رہا پھر سیدھا لڑکیوں کے گروہ کا رُخ کیا اور فوراً واپس آگیا ۔۔۔ "رقص کے لئے کہا تھا نہیں مانی۔"

موسیقی شروع ہوتی تو جرجبیس تیزی سے اس کی طرف جاتا اور انکار کرا کے واپس آجاتا۔ ایک دفعہ جو گیا تو بھاگا بھاگا آیا ۔۔۔ "وہ کہتی ہے یہاں اتنے لڑکے بیٹھے ہیں جو تم سے لاکھ درجے بہتر ہیں بھلا تم میں ایسی کون سی خوبی ہے جس پہ اِترا رہے ہو، ۔۔۔ للّٰہ کوئی منہ توڑ جواب سوچو تاکہ اسے چپ کرادوں ۔۔۔" میں نے مشورہ دیا کہ اس موضوع پر فارسی کا ایک شعر ہے۔ گلشن میں صبح صبح بلبل نے گلاب کے پھول سے کہا کہ چاروں طرف

کتنے پھول کھلے ہوئے ہیں جو رنگ روپ میں تجھ سے بہتر ہیں — پھول نے جواب دیا یہ سچ ہے مگر اپنے محبوب سے کوئی اس طرح بھی کلام کیا کرتا ہے؟

وہ سرپٹ دوڑ گیا — پھر واپس مشورہ لینے آیا، پھر چلا گیا، پھر آیا تو پیچھے پیچھے وہ بھی آئی — "تو آپ اُسے پڑھا پڑھا کر بھیج رہے ہیں خود میدان میں آئیے —"

روز اور موہن پہلے سے تیار بیٹھے تھے، ہم دوسری طرف چلے گئے۔ اتنے میں ایک پیاری سی لڑکی آئی اور گروہ میں شامل ہو گئی اس کے رخسار پر تل تھا — یہ آپ کا تل —، جر جیس کچھ کہنے لگا تھا میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں ہند سے آیا ہوں —"

"یہاں آنے سے پہلے آپ نے عراق کا نام سنا تھا؟" ایک لڑکی نے پوچھا۔

"بچہ بچہ اس نام سے آشنا ہے" — تا تریاق از عراق آورده شود مار گزیده مرده شود والی کہاوت کا ترجمہ سنا دیا۔

"اور بغداد؟"

"بغدادی چور کو کون نہیں جانتا —"

"اور بصرہ؟"

"اس پر تو گیت لکھے جا چکے ہیں — ایک حسینہ ہند سے فرار ہو کر بصرہ پہنچ گئی ہے۔ ہندی نوجوان کسی لٹھ باز سے درخواست کرتے ہیں کہ اسے گھیر کر واپس لے آئے —"

"یہ تو کچھ نہیں —" تل والی نے منہ بنا کر کہا

"موہن میرے کان میں بولا —" خان صاحب میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ ترجمے میں وہ بات پیدا نہیں ہوتی — ایک اخبار میں ڈاگ ریس، کا ترجمہ کتوں کی گھڑ دوڑ میں میں نے خود پڑھا تھا —"

"آپ کے یہاں رومانی گیت بھی تو ہوتے ہوں گے؟"

"پہلے ہوا کرتے تھے اب فلمی گانے رہ گئے ہیں ____

"پرانے گیتوں میں سے کوئی سنائیے ____"

سہیلیاں آپس میں باتیں کر رہی ہیں ایک کہتی ہے ____ میرے چھیل چھبیلے بانکے سپاہی کو دیکھا اس رنگ رنگیلے جھوٹے ہرجائی کا کیا پوچھتی ہو ____ اس جیسا زمانے میں کوئی نہیں ہے۔"

"ہائے! تمہارے ہاں جھوٹے محبوب کو بھی پسند کیا جاتا ہے!"

"من موہنا محبوب جھوٹا بھی ہو تب بھی اس محبوب سے کہیں اچھا لگتا ہے جو سچ بولتا ہو مگر غیر دلچسپ اور نکھٹو ہو ____ محبوب سے الفت اس کی خوبیوں کی بنا پر ہی نہیں کیجاتی محبت تو اس کی برائیوں کے باوجود بھی ہو جاتی ہے ____ ، اور پھر چھوٹی موٹی چالیں ذرا سا جھوٹ تھوڑی سی ہیرا پھیری محبت اور جنگ دونوں میں جائز ہیں ____"

"لیکن ہم سپاہیوں سے کتراتے ہیں وہ کسی دن دور چلے جاتے ہیں ____"

"اگر وہ چلتے پھرتے نہ رہیں تو ان سے ملاقات کیوں کر ہو ____؟"

"لیکن ایک مشرقی لڑکی کسی ہرجائی کو کیسے پسند کر سکتی ہے ____"

"یہ مشرقی لڑکی کیا ہوتی ہے؟ مشرقی ایشیائی مغربی کی اضافت محض دُم چھلا ہے۔ لڑکی ہر جگہ لڑکی ہوتی ہے اور محبوب محبوب ہوتا ہے ہرجائی ہو یا اور کچھ ____"

"ہمیں ایک گیت اور سنائیے ____" تل والی کے نازک ہونٹ ہلے۔

"ایک حسینہ سوچ رہی ہے ____"

اچانک زیور کیوں بھانے لگے ہیں؟
کہیں سہاگ کے دن تو نہیں آرہے؟
یہ صحرا میں تتلیاں کہاں سے آگئیں؟
ویرانوں میں پھول کون کھلا گیا؟
ایسی سہانی رُت تو کبھی نہیں آئی؟

میرے اللہ کیا ہونے والا ہے!

"ہائے یہ تو بجد لطیف ہے ـــــ" رخسار سرخ ہو گئے اور تل نمایاں ہو گیا۔ اس کا نام سعدہ تھا! اور جس نے جر جیس کو پریشان کر رکھا تھا وہ لوئی زا تھی

موہن نے پھر سر گوشی کی۔ ـــــ

"ایسی ماڈرن لڑکیاں تو ہر ملک میں مل جاتی ہیں یہاں کی اصلی لڑکیوں سے بھی ملاقات ہونی چاہیئے"

میں نے اسے بتایا کہ یہاں کی زبان سمجھ میں نہیں آتی، ملاقات کا وقت تک مقرر نہیں کیا جا سکتا، دن تو آسان ہیں، اتوار یوم الاحد تھا اس سے آگے انگلیوں پر گن سکتے ہیں، یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک بجے الساعۃ واحدہ ہوتی ہے۔ الساعۃ خمس پر پانچ بجتے ہیں لیکن جب کوئی الساعۃ واحدہ ونصف الاخمس دقائق کہہ کر چل دے تو فرشتوں تک کو خبر نہیں ہوتی کہ اس نے ایک بج کر پچیس منٹ کا وقت دیا ہے یا الساعۃ اثنتان وثلث سے مراد دو بجکر بیس منٹ ہے"

"لیکن زبان تو سیکھنی پڑے گی"

میں نے منصور سے کہا کہ مقامی باشندوں سے بھی ملنا چاہیئے ـــــ

"اب تم سے کئی ملیں گے ـــــ" وہ مسکرا کر بولا چنانچہ سلیم خود ملنے آیا ـــــ چھوٹے قد کا پلا ہوا چکنا چپڑا سا انسان ـــــ موٹی سی ابھری ہوئی ناک ہاتھوں کلائیوں، گردن اور کانوں پر بال ہی بال تھے مگر سر پر کچھ نہیں تھا

"بزنس کے علاوہ اس سے کسی اور موضوع پر گفتگو کرو ـــــ" منصور نے سب کو بتایا

"مسعودی نے لکھا ہے کہ ـــــ"

"مسعودی کون تھا؟" سلیم نے گھبرا کر پوچھا۔

"اپنے زمانے کا مشہور مورخ تھا ـــــ"

"مورخ تھا؟ ـــــ اچھا!"

"ابن بطوطہ بغداد آیا تو اسے یہ شہر پسند نہیں آیا؟"
"کیوں ——؟" وہ چونکا۔
"یہ ابن بطوطہ سے پوچھیے ——؟"
"ابن بطوطہ کون تھا ——؟"
"سیاح تھا ——"
"سیاح تھا؟ —— اچھا!" —— دیر تک اسی قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔
اس کے جانے کے بعد منصور بولا —— "بغداد میں رہتا ہے —— میں نے کہا تھا نا کہ شہریوں سے ملنا بیکار ہے۔"
"یہ آیا کس سلسلے میں تھا؟"
"سعدہ کا عاشق ہے —— تم سے ملنے آیا تھا"
"کہیں خفا تو نہیں ہو گیا؟"
"نہیں —— پھر آئے گا ——"
اگلی دفعہ اپنے ساتھ ایک اور موٹا تازہ چکنا گنجا دوست لایا جو کسی سکول میں مدرس تھا۔
فوراً منصور نے چوٹ کی —— "یہ بتائیے کہ ہمارے بڑے بڑے عالم الاصفہانی، المصری، البیرونی، البلخی، الہندی الخوارزمی کیوں تھے، کوئی العراقی، البغدادی یا الموصلی بھی گزرا ہے؟"
"الکردی بھی کوئی نہیں تھا ——" سلیم کا دوست بولا۔
"پہلے میرے سوال کا جواب دیجیے ——"
"عربی ادب کی جامع فہرست البغدادی نے مرتب نہیں کی تھی؟ ——"
"لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ بغداد کے تھے یا یہاں تھوڑے سے عرصے کے لئے رہے تھے کیونکہ یہ کتاب قسطنطنیہ میں مرتب ہوئی تھی ——۔"

"ہاں لیا کہ بغدادیوں نے کچھ نہیں کیا، کردوں نے کون سے تیر مارے تھے؟"

"کردوں نے چنگیز خاں کی فاتح فوج کو پہلی مرتبہ شکست کا مزہ چکھایا اس کے بعد طغرل خاں کو خوار کیا اگر کرد اسے نہ روکتے تو اسی ریلے میں منگول شمالی افریقہ تک پہنچ جاتے۔ کردوں نے چنگیز کے پوتے ہلاکو کو بغداد جانے والی شاہراہ سے نہیں گزرنے دیا، — مجبوراً اسے ایران سے ہو کر آنا پڑا — بغداد کو تباہ کر کے اس کی فوجیں ہمارے پہاڑوں کے قریب آئیں تو ہم نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا —"

"آپ تو ساری قوم کا ذکر کر رہے ہیں — کسی ایک کرد کا نام لیجئے۔"

"غازی صلاح الدین جیسا عظیم الشان آج تک کسی اور ملک نے پیدا کیا ہے؟"

سلیم کا دوست خاموش ہو گیا لیکن سلیم نے گلا صاف کرتے ہوئے شکایت کی — "جب جانتے ہو کہ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تو پھر کیوں پوچھتے ہو — اگر میں سوال کروں کہ چمڑے کا بھاؤ کیا ہے؟ آج کل فولاد خریدا تو نفع ہو گا یا نقصان؟ کپاس اور چاول کے نرخ کس طرف جا رہے ہیں؟ تو پھر؟"

اگلے روز منصور نے پوچھا کہ اب ایک صحرا نشین شیخ سے ملو گے؟ میں نے بدوؤں کی مہمان نوازی کی کہانیاں سنی تھیں۔ کہ جو بدو شہروں سے دور صحرا میں رہتے ہیں وہ واقعی مہمان کو سر آنکھوں پر بیٹھاتے ہیں — کوئی آ جائے تو یہ کبھی نہیں کہا جاتا کہ صاحب گھر میں نہیں ہیں۔ یا بیمار ہے ہیں بلکہ یہ شعر پڑھا جاتا ہے — اے ہمارے معزز مہمان آپ دور سے تشریف لائے، ہماری عزت افزائی فرمائی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم مہمان ہیں اور آپ صاحب خانہ، — (مہمان بھی شرافت سے کام لیتا ہے اور اگلی صبح کو روانہ ہو جاتا ہے) ایسے موقعوں پر میزبان کی بیوی کا نام نہیں لیا جاتا اگر وہ ڈنر میں شامل نہ ہو تو اسے دقیانوسی نہیں سمجھا جاتا، اتفاقاً اس کا ذکر آ جائے تو مہمان ادب سے اُسے اُم العیال کہتے ہیں یہ بھی سُنا تھا کہ بدو کی دعوت ہمیشہ قبول کر لینی چاہیئے — ایک مرتبہ کسی شیخ نے ایک غیر ملکی کو شادی کی تقریب پر مدعو کیا اس نے معذوری ظاہر کی اور معافی مانگ لی۔ چنانچہ صحیح تاریخ پر

اسے اغوا کرلیا گیا اور دعوت میں شامل کرکے بعد میں واپس بھیج دیا گیا۔ اگلے روز اسے شیخ کا خط ملا جس میں شمولیت کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔

شیخ کا دعوت نامہ آیا تو ہم سب گئے ـــــ کئی گھنٹوں کی مسافت کے بعد نخلستان آیا، شیخ ہمارا منتظر تھا۔ اسّی کے لگ بھگ عمر، تانبے جیسا رنگ، کشادہ سینہ، مسکراتا ہوا چہرہ، بتیس دانتوں میں سے ایک بھی مصنوعی نہیں تھا۔ اس جوان بوڑھے کو دیکھ کر ہم جوانوں پر بڑھاپا طاری ہوگیا۔ کئی ملازم مودب... کھڑے تھے لیکن وہ کسی کو ہمارے قریب نہ آنے دیتا، خود سگریٹ پیش کرتا، سلگاتا۔ راکھ دانی سامنے رکھتا، شربت بنا کر دیتا۔ پھر ہم سب کو دوسرے کمرے میں لے گیا، دروازہ بند کرکے الماری کھولی ـــــ "میں خود تو اس سے محروم ہوں لیکن معزز مہمان شوق فرمائیں ـــــ" اس نے انگریزوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

الماری میں وہسکی اور سوڈے کی بوتلیں تھیں جن پر گرد جمع تھی ـــــ طشت میں برف کی ڈلیاں تھیں۔ سب خاموش ہوگئے کسی نے ہاتھ تک نہ لگایا۔

ضیافت بجد پرتکلف تھی لیکن اس نے ایک لقمہ نہ چکھا مہمانوں کے سامنے چیزیں رکھتا رہا اور اتنی دیر کھڑا رہا۔

"اس عمر میں ایسی قابلِ رشک صحت کا راز کیا ہے؟" برٹن نے پوچھا جس کے آدھے سے زیادہ دانت مصنوعی تھے۔

"نخلستان میں کئی ایسے ہیں جو مجھ سے بڑے اور مجھ سے زیادہ تندرست ہیں ـــــ"

"سنا ہے کہ آپ اسّی برس کے ہیں ـــــ"

"اسّی برس کا اس لئے ہوں کہ میں اٹھارہ سو ساٹھ کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا ـــــ"

سب ہنسنے لگے ـــــ"

"منصور کہتا ہے کہ آپ کی ازدواجی زندگی بجد خوشگوار رہی ہے، شادی ہوئے ساٹھ برس گزر گئے لیکن کبھی ام العیال سے لڑائی نہیں ہوئی ـــــ آپ نے یہ معرکہ کیسے مارا؟"

برٹن نے پوچھا۔

"میں اپنے کاموں میں مصروف رہتا ہوں اور میری بیوی گھر کے دھندوں میں لگی رہتی ہے لڑنے کی فرصت ہی نہیں ملتی ——"

"آپ چھپا رہے ہیں —— کوئی وجہ تو ضرور ہوگی ——؟"

"مدتیں گزریں ایک معمولی سا واقعہ ضرور پیش آیا تھا —— میں بے حد مفلس تھا کسی سے اونٹنی مانگ کر شادی کرنے گیا سادہ سی رسم کرنے کے بعد بیوی کو اونٹنی پر بٹھا کر واپس روانہ ہوا —— ایک جگہ اونٹنی بلا کسی وجہ کے مچلنے لگی، بہتیرا پیار کیا تھپتھپایا لیکن قابو میں نہ آئی، نیچے اتر کر مہاریں کھینچیں بڑی مشکل سے سیدھی ہوئی تو اُسے تنبیہہ کی —— اونٹنی! یہ حرکت پہلی دفعہ کی ہے پھر مت کرنا —— ہم روانہ ہوئے بمشکل آدھ میل گئے ہوں گے کہ جھاڑیوں سے چند پرندے اڑے اونٹنی بدک کر کودنے لگی میں پھر چھلانگ کر نیچے اترا، بڑی مصیبتوں سے اُسے رام کیا اور اُس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا —— خبردار اونٹنی! یہ دوسری دفعہ ہے!! آگے کھیت میں ذرا ذرا پانی کھڑا تھا وہ پھر مستیاں کرنے لگی۔ میں نے کندھے سے بندوق اُتار کر اونٹنی کو وہیں ہلاک کر دیا۔ بیوی تو اب تک بالکل گونگی تھی یا یکلخت برس پڑی، مجھے خردماغ، ظالم اور بے وقوف کہا کہ طیش میں آ کر اتنا نقصان کر لیا، اپنے والدین کو کوسا کہ ایسے اُجڈ کے پلے باندھ دیا —— میں نے سب کچھ سن کر تنبیہہ کی —— "خبردار بیوی! یہ پہلی دفعہ ہے!!" حضرات ساٹھ برس گزر گئے اور دوسری مرتبہ خبردار کرنے کی ضرورت نہیں پڑی —— ، بوڑھے نے قہقہہ لگایا۔ واپسی پر منصور بولا —— "یہ چشموں کے پانی کا اثر ہے —— دریا کے پانی میں یہ بات کہاں؟"

"لیکن دنیا کی قدیم ترین بستیاں دریاؤں کے کناروں پر آباد ہوئی تھیں، چھ سات ہزار سال پہلے انسان نے پہلا مکان اور پہلا گاؤں دجلہ و فرات پر بنایا تھا" —— برٹن نے کہا۔

فرات کی طرح دجلہ بھی ترکی کے پہاڑوں سے نکلتا ہے کردستانی پہاڑیوں کے بعد جب میدانی علاقہ آتا ہے تو اس میں دو دریا گرتے ہیں۔ جو ذرا لمبا ہے ۔۔۔ اسے الزاب الاعلیٰ کہا جاتا ہے اور دوسرے کو الزاب الاسفل (محض پچاس ساٹھ میل کے لئے کسی دریا کو بُرا بھلا کہنا سراسر زیادتی ہے)

شمال میں ایک جگہ ایسی ہے جہاں دجلہ و فرات تقریباً آپس میں مل جاتے ہیں، میدانوں میں نہریں انھیں ملاتی ہیں پھر قرنا کے قریب واقعی مل کر شط العرب بن جاتے ہیں اور بالآخر خلیج فارس میں جا گرتے ہیں، شروع سے آخر تک ان کی یہی کوشش رہتی ہے کہ اکٹھے رہیں.

دونوں میں طغیانی آتی ہے، دونوں گدلے ہیں، دونوں ویرانے سے گزرتے ہیں دونوں کے کناروں پر قدیم ترین تہذیبوں کے کھنڈرات ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ فرات اور اس کے یورپین نام یوفریٹیز میں کچھ مطابقت ہے لیکن دجلے کا ٹائیگرس سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا.

کہتے ہیں طوفانِ نوح یہیں آیا تھا اور باغ عدن قرنا کے قریب تھا (عدن والے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں تھا) اور یہ کہ پرانے زمانے میں دونوں دریا علٰحدہ علٰحدہ سمندر میں گرتے تھے، مٹی سے دہانے اٹتے گئے زمین بنتی گئی اور سمندر دور ہوتا گیا۔

دریاؤں کی مٹی نے میسوپوٹیمیا (یعنی دوآبے) کو ہزاروں سال سے زرخیز بنائے رکھا ۔۔۔

مدتیں گزریں کہ دنیا کی سب سے پہلی قوموں کی ملاقات خلیج فارس کے ساحل پر ہوئی ۔۔۔ تین مختلف قسموں کے انسان آپس میں ملے۔ دراوڑ جو کہ غالباً ہندوستانی تھا مکران کی طرف سے آیا تھا، حامی افریقہ سے اور منگول وسط ایشیا سے۔ یہاں سبزہ تھا پانی کی افراط تھی، غالباً یہ لوگ سبزی دیکھ کر خوش ہوئے ہوں گے، ممکن ہے کہ ایک دوسرے کو حیرت سے

گھورا ہو (ان دنوں بھی ترچھی آنکھوں والے چینی جاپانی دوسری قوموں کو پہلی مرتبہ دیکھ کر حیران ہوئے ہونگے کہ اُنکی آنکھیں عجیب ہیں)

بہرحال ان دنوں نسل، رنگ وغیرہ کا امتیاز نہیں تھا۔ یہ لوگ متمل تھے لہذا اکٹھے رہنے لگے لیکن بہت جلد دوآبے کی خوش حالی کی خبر ادھر ادھر پہنچ گئی اور اغیار کشاں کشاں آنے لگے۔

نسلِ انسانی آہستہ آہستہ تہذیب یافتہ ہو رہی تھی چنانچہ جنگیں شروع ہوگئیں۔ ۳۵۰۰ء قبل از مسیح کے لگ بھگ پہیہ ایجاد ہوا تا کہ حملہ کرتے اور بھاگتے میں آسانی رہے۔ تانبے کا استعمال شروع ہوا۔ آئینہ بنایا گیا اور اس کے ساتھ ہی میک اپ کا سامان (اور خواتین ہر جگہ لیٹ پہنچنے لگیں)

جنوبی علاقے میں سُمیرین لوگوں نے اپنی حکومت کی بنیاد رکھی اور سیلابِ عظیم کی کہانی بیان کی۔ (جو طوفانِ نوح کے تذکرے سے ملتی جلتی ہے) پہلے اشیاء کا مبادلہ اشیاء سے ہوتا تھا انھوں نے چاندی رائج کرکے "زر" کا ریکٹ شروع کیا۔ زر کے ساتھ لکھا پڑھی لازمی ہے چنانچہ "میخی رسم الخط" جاری کرنا پڑا اور روپے پیسے کے سلسلے میں انسان نے پہلی مرتبہ لکھنا پڑھنا سیکھا۔ ان باتوں کے قصے جہاں جہاں پہنچے حملہ آور ساتھ لائے (حملہ آوروں کی کبھی کمی نہیں رہی) شمال سے سامی لوگ آدھمکے، عکادیوں نے دکھیا دکھی حملے شروع کئے، جو چار سو برس تک جاری رہے (ایک دفعہ پہاڑ کی سمت سے حملہ شروع ہو جائے تو ختم ہونے میں نہیں آتا) حالات اس قدر خراب ہو گئے کہ تنگ آکر سمیرین لوگوں کو جنگِ آزادی لڑنی پڑی اور غیر ملکیوں کو بھگانا پڑا انھوں نے دوبارہ آزاد ہو کر بابل بسایا۔ بابل کے معنے تھے 'دیوتا کا دروازہ' لیکن بعد میں یہودیوں نے بتایا کہ اُن کی زبان میں بابل انتشار کو کہتے ہیں (یہودی ہمیشہ الٹا مطلب نکالتے ہیں) بابل کا شہرہ ہندوستان میں پہنچا تو حملہ کرنے کی بجائے 'بابل کے دیس' اور 'بابل مورا نیہر چھوٹا جائے' گاکر

محفوظ ہوئے۔

سُمیرین لوگوں نے فریقین میں بیچ بچاؤ کرانے کے لئے پہلی مرتبہ ثالث مقرر کئے (تنازعے چکانے کے لئے یہ طریقہ پانچ ہزار سال سے استعمال کیا جاتا ہے اور ہر مرتبہ فیل ہوتا ہے) ان لوگوں کو جنت و جہنّم کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ چنانچہ اُن کا مذہب فقط اسی دنیا تک محدود تھا۔ ان کے مشہور بادشاہ حمُورابی نے مٹی کی تختیوں پر اپنے ماتحتوں کو خطوط لکھوائے اسے اپنی زندگی میں شبہہ تک نہ ہوا کہ مکاتیب حمُورابی کے ذریعہ وہ دنیا کے اوّل ترین قوانین وضع کر رہا ہے۔ ان دو سو بیاسی قوانین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ کافی تہذیب یافتہ تھے۔ ان کے ہاں انکم ٹیکس والے تھے اور رشوت و سفارشیں کرنے والے افسر بھی۔ حمُورابی نے سماج کو تین حصّوں میں تقسیم کیا —— آزاد لوگ، نیم آزاد اور غلام (یہ تقسیم مدتوں تک رہی) ہر چیز کی قیمت مقرر کی گئی اور پبلک سے کہا گیا کہ ایک سے زائد شادی نہ کریں، قافلوں کا کرایہ نامہ اور ٹائم ٹیبل بنایا گیا۔ قرض کے سلسلے میں سود رائج کیا اور سزائے موت کی قسمیں مقرر کیں مثلاً زہر کھانا، دریا میں ڈوب کے مرجانا وغیرہ، ٹھیکیداروں، طبیبوں، اور دفتری کارروائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا —— یعنی مکان کے قبل از وقت گر جانے سے بیٹا دب کے مرجائے تو تعمیر کرنے والے ٹھیکیدار کے لڑکے کو مار دیا جاتا تھا، بے توجہی یا لالچ پر طبیب کو پکڑ کر حکام لے جاتے تھے۔ طبیبوں کے پاس مہریں تھیں جنھیں وہ نسخوں پر لگاتے تھے (اس زمانے کے نسخے بہت مختصر ہوتے تھے مثلاً دانت کے درد کے لئے سورج مکھی پیس کر لگاؤ، پیٹ میں درد ہو تو دودھ پیو —— گنجے پن کے لئے سر پر شراب اور تیل کی مالش کرو) کسی کے پاس رقم یا جائیداد ہو مگر متعلقہ کاغذات نہ ہوں تو سزائے موت ملتی تھی تہمت لگا کر نہ ثابت کر سکنے پر بھی سزائے موت —— جرمانے غریبوں کے لئے کم تھے اور امیروں کے لئے زیادہ۔ آنکھ کے بدلے آنکھ دانت کے بدلے دانت کے قانون نے دندان سازوں پر ضرور اثر ڈالا ہوگا۔ حمُورابی

کے ان سخت قوانین نے (جن میں غالباً سب سے نرم سزا موت تھی) رعایا کے حقوق اور اُن کی ملکیت کی پوری پوری حفاظت کی اور عورتوں کو مردوں کے برابر لا کھڑا کیا وہ مردوں پر مقدمے دائر کر کے اُن سے طلاق لے سکتی تھیں جائیداد پر قبضہ کر سکتی تھیں۔

ان دنوں لوگوں کو ایک خاص وضع کی عجیب و غریب عمارت بنانے کا بہت شوق تھا۔ پختہ اینٹوں میں گھاس اور نرسل کی تہیں جما کر ایک عظیم الشان چبوترہ تعمیر کیا جاتا تھا جس کی سات منزلیں ہوتیں جو لمبائی چوڑائی میں سکڑتی چلی جاتیں۔ دن کے وقت یہ عمارت مندر کہلاتی تھی اور رات کو سیڑھیوں سے ستاروں کا مطالعہ ہوتا تھا۔ محققین کا خیال ہے کہ اس طرح پہاڑیاں بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا کیونکہ اگر علاقہ پہاڑی نہ ہو تو وہاں پہاڑیاں بنانا بہت مشکل ہے۔ روایت ہے کہ بابل کا مینار جس پر تباہی آئی تھی اسی قسم کا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چبوترہ آسانی سے مسمار نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے چند عمارتیں (جنھیں زگرت کہا جاتا ہے) اب بھی موجود ہیں اور اُن کی تہوں کا گھاس اونٹ کھاتے ہیں۔

بیسویں صدی قبل از مسیح میں پھر ہڑبونگ مچی، شمال سے خانہ بدوشوں نے ہلّہ بول دیا، حطیطی آئے، کسیتی آئے اور سُمیرین حکومت تباہ ہو گئی۔ اس مرتبہ حملہ آور گھوڑوں پر سوار ہو کر آئے تھے۔ بابل والوں نے پہلی مرتبہ اس جانور کو دیکھا تو اُسے پہاڑی گدھا کہا (بابل والے شیر کو بڑا سا کتا اور موتیوں کو مچھلی کی آنکھیں کہا کرتے تھے، غالباً انھیں غلط نام رکھنے کا شوق تھا) ساتھ ساتھ دجلے کے کنارے بڑی مشقت پسند اور مضبوط قوم آباد ہو گئی۔ یہ اشور کا دارالخلافہ بنا کر اشورین بن گئے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ہر وقت لڑتے رہنا ہی بہترین دفاع ہے چنانچہ جنگ کا ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا وہ یہ کہ مار مار کر دشمن کا بھرکس نکال دو (قیدیوں کا بھی)، پھر مفتوحہ شہروں پر اچھی طرح ہل چلا کر بیان دے دو کہ ہمیں تو دشمن سے خطرہ تھا۔

شروع شروع میں یہ ڈنڈے مار نظریہ بڑا کامیاب ثابت ہوا ــــــ بابل کو تلوار سے مطیع نہ کر سکے تو دریا کا رُخ بدل دیا شہر میں پانی آگیا اور لوگ بھاگ نکلے۔ اس قدیم پایۂ تخت کو تباہ کر کے نئے پایۂ تخت کی فکر پڑی۔ افسوس بھی ہوا کہ اگر زیادتی نہ کی ہوتی تو مناسب ترمیم واضافے کے بعد بابل اچھا بھلا دارالخلافہ بن سکتا تھا۔ آخر پھر واپس شمال کی طرف روانہ ہوئے اور دجلے کے کنارے نینوا کو چُنا جو معمولی سا گاؤں تھا۔ نیا شہر کافی مہنگا پڑا۔ جگہ جگہ دیواروں پر لمبی لمبی داڑھیوں والے شیر بنائے گئے جنکے کندھوں پر بڑے بڑے پَر تھے (یہ شیر برٹش میوزیم میں رکھے ہیں) داڑھیوں والے بیل بھی نصب کئے گئے (اشوریوں کو انسانوں سے زیادہ حیوان پسند تھے)۔

حمورابی کے قوانین منسوخ کر کے انھوں نے دنیا کو تباہ کرنے کا ارادہ کیا (اشوریوں کے طرفدار کہتے ہیں کہ بیچاروں کو اتنا کڑا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا کہ ادائیگی کے لئے دوسرے ملکوں میں لوٹ مار کرنی پڑی تھی) لیکن دوسرے ملکوں کو اشوری فلسفۂ حیات معلوم ہو چکا تھا، چنانچہ اشوریوں کی سلطنت سو برس تک بھی نہیں چلی، نینوا کی تباہی پر (جو اشوریوں کے پسندیدہ طریق سے کی گئی تھی) سارے ملک خوش ہوئے (اس واقعہ کے دو سو سال بعد یونانی مورخ زینوفن نینوا سے گزرا تو وہاں نہ نینوا تھا نہ کوئی اشوری) ویسے اشوری اتنے بُرے بھی نہیں تھے کبھی جنگ وجدل سے فرصت ملتی تو حطیطیوں کی لکھی ہوئی تختیاں اکٹھی کر کے لائبریریاں بناتے، آخری اشوری بادشاہ اشور بنی پال نے دنیا کی پہلی لائبریری بنائی۔ لائبریری کے کھنڈر سے بائیس ہزار پختہ مٹی کی تختیاں ملی ہیں (جو حسب معمول برٹش میوزیم میں ہیں) فہرست کتب کے علاوہ اس کے مختلف سیکشن تھے ــــــ مذہب، سائنس، تاریخ، ادب ــــــ (لیکن اُن کے مصنف اشوری نہیں تھے) ہر تختی پر شاہی حکم درج تھا کہ اسے لائبریری سے باہر لے جانا منع ہے۔ ایسی کتابوں کا چرانا محال ہوتا ہوگا، آتنی وزنی چیز کوئی چھپا کر نہیں لے جا سکتا خصوصاً جب کتاب کے پاش پاش ہو جانے کا بھی

ڈر ہو۔

اب میڈین لوگوں کی باری آئی ــــــ یہ بڑی سخت قوم تھی، جب سیتھین لوگوں نے اُن پر حملہ کیا تو لڑتے رہے ہار نہیں مانی حتیٰ کہ اٹھائیس برس گزر گئے اور کوئی فیصلہ نہیں ہوا (حملہ آور تنگ آکر واپس لوٹے تو معلوم ہوا کہ عورتوں نے پہلے انتظار کیا پھر غلاموں سے شادی کرلی چنانچہ آقاؤں نے دارالخلافے کو گھیر کر تلواریں نکال لیں۔ غلاموں نے مقابلہ کیا۔ کئی دنوں کی شدید لڑائی کے بعد کسی جہاں دیدہ بزرگ نے مشورہ دیا کہ غلاموں سے برابر کا سلوک کرنا ہی بے وقوفی ہے، کل تلواروں کے بجائے ڈنڈے اور دُرّے استعمال کرو ــــــ چنانچہ اگلے روز آقا گالیاں دیتے ہوئے بڑھے اور غلاموں کو زدوکوب کرنا شروع کردیا ــــــ غلاموں نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے اور مشہور ذہنیت کا ثبوت دے دیا۔)

ساتویں صدی ق۔م کلدانی اور میڈین آئے۔ چونکہ کلدانی دستِ خاص سے نینوا پر ہل چلا چکے تھے اس لئے آتے ہی انھیں دارالخلافے کی فکر پڑی۔ نینوا کو از سرِ نو تعمیر کرنے میں جگ ہنسائی کا ڈر تھا اس لئے انھوں نے مجبوراً پرانے بابل کو چنا۔ بابل جدید میں کلدانی بادشاہ بنوکدنظر نے چالیس برس تک حکومت کی، جوانی میں کسی پہاڑی دوشیزہ سے شادی کر بیٹھا تھا جو اُن تپتے ہوئے میدانوں میں پہاڑوں کو یاد کرکے آنسو بہایا کرتی (گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہوتے ہی لڑکیاں پہاڑوں کو یاد کرنے لگتی ہیں!) بادشاہ نے بہتیرا سمجھایا بجھایا آخر اُسے معلق باغات تعمیر کرانے پڑے (جو بعد میں زمانۂ قدیم کے سات عجائبات میں شامل ہوئے) معلق باغات کے متعلق قیاس آرائیاں ہوتی ہیں کہ وہ کیسے تھے۔ جو کچھ کتابوں میں لکھا ہے اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ لاہور کی شملہ پہاڑی سے ملتے جلتے تھے۔ شاید ملکہ معلق باغات سے بھی مطمئن نہیں ہوئی (کیونکہ اُن پر چھدرے چھدرے درخت تو تھے خنکی نہیں تھی)، کہتے ہیں کہ بنوکدنظر نے بیوی کی دائمی افسردگی سے تنگ آکر اعلان

کی طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کے عہد میں علم ہیئت کو بڑی ترقی ہوئی اور پہلا کیلنڈر مرتب ہوا۔ پھر بادشاہ نے دورے پر جانا شروع کیا۔ مصریوں کو شکست دی، یروشلم کو تباہ کر کے اتنے غلام ساتھ لے آئے کہ اب بھی بغداد میں یہودی ہیں (یہودی کہیں آجائیں تو پھر واپس نہیں جاتے۔)

ویسے یہ لوگ اشوریوں سے مختلف تھے اور مقابلتہً صلح پسند تھے۔ اُنکی ایک کہاوت ہے —— لوگ جھگڑ رہے ہوں تو کان دبا کر چپ چاپ نکل جاؤ ورنہ گواہ بننا پڑے گا۔ اور عدالت میں جو درگت گواہ کی بنتی ہے اُسکا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ——

بنوکدنضر نے دجلے پر بند تعمیر کیا، نہریں کھدوائیں۔ جہاں اس میں اور خوبیاں تھیں وہاں ایک عیب بھی تھا —— ہر وقت وہ بابل ہی کی توسیع کرتا رہتا تھا۔ بسے بسائے شہر کو اُس نے تین مرتبہ پھر بسایا۔ نئے محل بن رہے ہیں سڑکیں چوڑی کی جا رہی ہیں بلکہ پرانی سڑکوں کے اوپر نئی سڑکیں بن رہی ہیں —— آخر رعایا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا اور شہر کی سطح اونچی ہوتی گئی۔

گمنامی کے ڈر سے اُس نے ہر اینٹ پر اس قسم کے فقرے لکھوا دیے "کیا میرا تعمیر کردہ بابل دنیا کا عظیم ترین شہر نہیں ہے؟" "میں شاہ بنوپلیسر کا بیٹا بنوکدنضر والی بابل ہوں" (یہ اینٹیں اب بھی موجود ہیں) اس پروپگنڈے سے سیاح اور مورخ کافی متاثر ہوئے۔ زینوفن ہوا پھر بابائے تاریخ ہیروڈوٹس متاثر ہوا (ہیروڈوٹس بہت جلد متاثر ہو جاتا تھا تبھی اُسے بابائے جھوٹ بھی کہا جاتا ہے لیکن فاتح کچھ اتنے متاثر نہیں ہوئے، طاق کسریٰ میں یہی اینٹیں لگی ہوئی ہیں۔ عربوں نے بھی تعمیر کے سلسلے میں بنوکد کے شہر کا ملبہ استعمال کیا۔ اتنی ساری اینٹوں پر دستخط کرنے کا یہ فائدہ ضرور ہوا کہ کلدانیوں کے بادشاہوں کے مشکل —— ناموں سے لوگ مانوس نہیں ہیں لیکن بنوکدنضر کو سب جانتے ہیں۔

محققین کا خیال ہے کہ اگر آج فرعون مصر میں آئیں تو اپنے اہرام اور مندر دیکھ کر یقیناً خوش ہوں گے لیکن اس دوآبے کے قدیم بادشاہ آئیں تو انھیں مایوسی ہوگی کیوں کہ انکی ایک نشانی بھی تو باقی نہیں رہی۔ مصر میں پتھر ہے یہاں فقط اینٹیں تھیں وہ بھی آدھی کچی آدھی پکی اور ساتھ ساتھ لگاتار سیلاب، تپش اور حملہ آور —— مصری الگ تھلگ رہتے تھے اس لیے خوش تھے اُنھیں مذہب اور اگلی زندگی کا شروع سے خیال تھا —— (وہ لوگ بلیوں کو بہت متبرک مانتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حملہ آور آٹھ دس ہزار بلیاں ساتھ لے آئے جنگ شروع ہوتے ہی بلیوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا گیا تو مصریوں نے فوراً ہار مان لی)

دراصل دوآبے کی تہذیب عروج پر پہنچ چکی تھی۔ اب زوال شروع ہو چکا تھا —— تین ہزار سال پرانی نظم 'قنوطیت' سے اس انحطاط کا اندازہ لگ سکتا ہے ——

آقا اور غلام آپس میں باتیں کر رہے ہیں ——

"خادم کچھ کہوں؟"

"ارشاد! میں حضور سے متفق ہوں۔"

"محبت کرنیکو دل چاہتا ہے ——"

"ضرور کیجیے، حضور، محبت دکھ درد بھلا دیتی ہے۔"

"نہیں خادم، میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا، محبت تو ایک پھندا ہے ایک بھیانک غار ہے ——
اور عورت ایسی تیز تلوار ہے جو قریب آجائے تو موت یقینی ہے۔"

"خادم کچھ کہوں؟"

"ارشاد! میں حضور سے متفق ہوں۔"

"مقدس پانی لاؤ، وضو کر کے عبادت کروں گا۔"

"ضرور کیجئے حضور، عبادت سے دل صاف اور دیوتا خوش ہوتے ہیں۔"

"نہیں خادم، میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا، بار بار گڑگڑانے سے دیوتا اکڑنے لگتے ہیں ——
انھوں نے آپ کے لئے کیا کیا ہے جو آپ احسان مند ہیں۔"

"خادم کچھ کہوں؟"

"ارشاد! میں حضور سے متفق ہوں۔"

"غریبوں کو خیرات دی جائے؟"

"ضرور دیجئے حضور، اس سے کئی گنا آپ کو ملے گا۔"

"نہیں خادم میں نے ارادہ بدل دیا ہے۔"

"بہت اچھا کیا، سخی کا دیوالہ بھی نکل جائے تب بھی فقیر مطمئن نہیں ہوتے ——
قبرستان میں جا کر دیکھئے سخی اور کنجوس ایک ہی زمین میں دفن ہیں۔"

—— کئی موضوع آتے ہیں، لیکن یہ اکتاہٹ، یہ بیزاری نہیں جاتی، آخر طے ہو جاتا ہے
کہ ہر شے بے معنی ہے، بیکار ہے —— تنگ آکر آقا کہتا ہے ——

"خادم کچھ کہوں؟"

"ارشاد! میں حضور سے متفق ہوں۔"

"اگر یہی زندگی ہے تو کیا کریں؟ خودکشی کرلیں؟؟"

"ہم مجبور بندے ہیں، کسی نے دنیا کو بھی محیط کیا ہے؟ آسمان کو چھوا ہے؟؟"

"تو پھر آج تمھیں مارتا ہوں بعد میں خود مر جاؤں گا ——"

"بجا فرمایا جناب، لیکن خادم اپنے آقا کو یہاں مصیبتیں برداشت کرنے کے لئے کیسے
چھوڑ جائے؟ کیوں نہ دونوں ساتھ چلیں؟"

کلدانیوں نے اُر بھی بسایا تھا، جو حضرت ابراہیم کا گاؤں تھا اور جہاں انھیں

خدا تعالیٰ کی موجودگی کا خیال آیا، اُرسے وہ اپنے طویل سفر پر روانہ ہوئے تھے (مغربی مورخوں نے شام اور دیگر ملکوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے لیکن عرب کے بارے میں خاموش ہیں)

اس مرتبہ جو حملہ آور آئے انھیں نئے دار الخلافے کی تلاش تھی، نہ کلدانیوں سے کوئی خاص دشمنی تھی چنانچہ میڈیوں اور اخامنین (جنھیں ہخامنشی بھی کہا جاتا تھا) بابل کے پندرہ بیس ہزار آدمی مار کر دس بارہ مندر اور پانچ چھ محل وغیرہ تباہ کر کے مطمئن ہو گئے۔ دراصل اخامنین لوگوں نے اپنی اصلی قوت اور جوش و خروش کو یونانیوں کے لئے مخصوص کر رکھا تھا (جس کا بدلہ بعد میں سکندر نے لیا اور آس پاس کے ملک خواہ مخواہ گھیرے میں آ گئے۔)

ملک کی حالت زیادہ بُری نہیں تھی، اصلاحات کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی مگر حملہ آور جو ایران کے علاقے سے آئے تھے بابلیوں کی بہتری و بہبودی کے خواہاں تھے ——— انھیں جب کوئی نئی چیز ایجاد کرنے کو نہ ملی تو ناچار دنیا کی پہلی گھوڑا ایکسپریس شروع کی، جگہ جگہ گھوڑے بدلے جاتے، ایلچی ڈاک لے کر ڈیڑھ ہزار میل کا فاصلہ ایک ہفتے میں طے کرتے تھے (ایلچی بھی بدلے جاتے ہوں گے) ساتھ ساتھ آدابِ محفل، تکلفات و مقفیٰ عبارت رائج ہوئی۔ بعد میں جب چنگیز نے ایرانی کاتب سے کسی گورنر کے نام مختصر سا حکم نامہ لکھوایا تو کاتب فوراً دوسرے صفحے تک پہنچ گیا، چنگیز کو شبہ ہوا اُس نے کہا پڑھ کر سناؤ، کاتب نے "بخدمت جناب عالی مآب بلند اقبال حضور گورنر صاحب" سے شروع کیا تھا، مزاج، موسم اور کنبے کا حال پوچھنے کے بعد درخواست کی تھی کہ اگر بارِ خاطر نہ ہو تو یہ معمولی سی گذارش ———

چنگیز آگ بگولا ہو گیا، کاتب کو قتل کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ لوگوں نے بتایا کہ یہ تو یہاں کا رواج ہے۔ چنگیز نے آداب و القاب فوراً بند کرا دئے (جو اُس کے جانے کے بعد فوراً واپس آ گئے) چنگیز نے یہ بھی دیکھا کہ ہر شام لوگ شراب پی کر مدہوش ہو جاتے

ہیں چنانچہ اس نے حکم دیا کہ مہینے میں تین دفعہ سے زیادہ مدہوش ہونا جرم ہے۔ بعد میں مہینے میں چار دفعہ کی اجازت ہوگئی ہر سنیچر کی شام کو۔

سکندر اعظم پہلی مرتبہ بابل آیا تو دارا کا تعاقب کر رہا تھا۔ (یہ وہ دارا نہیں تھا جس کی فتوحات مشہور ہیں۔ کس لئے دارا مارا' والا بادشاہ دارا سوئم تھا جس کے دربار میں بے شمار خواجہ سرا تھے)

سکندر جلدی میں تھا اگرچہ پریڈ اور سفیروں سے ملاقات کے لئے اس نے وقت نکال لیا تھا) البتہ جب ہندوستان سے واپس آیا تو فرصت ہی فرصت تھی۔ پہلے سے کافی بدل چکا تھا' ایرانی لباس پہنا' بات بات پر بگڑ جاتا' وہمی ہوگیا تھا' جب اس کے استاد ارسطو کے پوتے کیلستھینز نے اسے سجدہ کرنے سے انکار کیا تو اسے مروا دیا۔ اس سے پہلے اپنے جگری دوست اور محسن کلائی ٹس کو خود اپنے ہاتھ سے قتل کر چکا تھا۔

دجلہ عبور کیا ہی تھا کہ بابل سے وفد آیا اور عرض کی کہ دیوتاؤں کا ارشاد ہے کہ آپ مغرب کی طرف نہ آئیں —— کئی یونانیوں نے بھی پیشین گوئی کی کہ یہ سفر آخری سفر ہے سکندر بابل پہنچا تو فصیل پر کوے لڑ رہے تھے ایک کوا سکندر پر گر پڑا' لوگوں نے شور مچایا کہ برا شگون ہے۔ پھر پتہ نہیں کیا ہوا ذرا ذرا سی بات منحوس بن جاتی ہر واقعے سے بدشگونی نکالی جاتی' ان سب نے مل کر سکندر کو یقین دلا دیا کہ آخری وقت قریب ہے۔ پھر بخار چڑھا۔ پہلے بھی کئی مرتبہ بخار چڑھا تھا لیکن تب اسے ایسی اوٹ پٹانگ پیشین گوئیوں پر یقین نہیں ہوا کرتا تھا۔ مرنے سے پہلے ساری فوج بستر مرگ کے قریب سے گزری آنکھوں سے ہر سپاہی کے سلام کا جواب دیا۔ پھر پردیکاس نے مہر نکالی۔

"شاہی مہر کسے دی جائے؟"

"جو سب سے قوی اور دلیر ہو اسے" —— مغرب کے وقت سکندر انتقال کر گیا۔ چند روز بابل والے سہمے سہمے رہے پھر اس جوانا مرگ فاتح کو بھول گئے جسے یاد

کرکے مینڈر اپنے گنجے سر پہ ہاتھ مار کر کہا کرتا۔ "میں تو کچھ نہ کرسکا ـــــــ میں تو بالکل نکما ہوں ـــــــ اس عمر میں سکندر دنیا فتح کرچکا تھا۔"

سکندر کے جانشین سیلوکس نے اٹھارہ انیس سکندریہ دیکھے تھے وہ مدت سے منتظر تھا کہ کبھی اپنا پرائیویٹ شہر بھی آباد کرے چنانچہ بابل کو خیرباد کہہ کر دجلہ کے کنارے اپنا سلوکیا بسایا۔ یہ شہر زیادہ دیر نہیں رہا، دراصل سکندر کی عظمت سے سیلوکس کا تخت اشور بالکل تباہ ہوچکا تھا۔

یونانیوں نے دجلہ عبور کیا تھا، یہ ناممکن تھا کہ رومن پیچھے رہ جاتے۔ اسکے علاوہ اپنی تہذیب و تمدن کے نشر و اشاعت کے سلسلے میں دوسرے ملکوں پر حملہ کرنا رومیوں کی پرانی عادت تھی (یہ انکی انتہائی شرافت تھی ورنہ مفلس اور ان پڑھ قوموں کو کون پوچھتا ہے) مجبوراً انھیں دجلہ و فرات کی وادی میں آنا پڑا۔

کہتے ہیں کہ رومن شہنشاہ تراجن کو سکندر ثانی کہلانے کا بڑا شوق تھا (یوسف ثانی بننے کی خواہش نے بھی بہتیروں کو پریشان کیا ہے) تراجن اسی راستے سے آیا جس راستے سے سکندر آیا تھا بالکل اسی سٹائل سے لڑتا لڑتا دوآبے میں داخل ہوا، وہاں سے اسے یاد آیا کہ سکندر ثانی بننے کے لئے ہندوستان پر حملہ کرنا بھی ضروری ہوگا۔ بیماریوں اور گرمیوں سے فوج کی بری حالت تھی لیکن تیاریاں شروع کردی گئیں۔

آخر وہی تراجن جس نے ڈینیوب کے کنارے چٹانوں پر یہ لکھوایا تھا ـــــــ "اس کٹھن علاقے کے سرکش اور جنگجو قبیلوں کو شہنشاہ تراجن نے اپنی تلوار سے زیر کیا" ـــــــ خلیج فارس کے ساحل پر بھوں بھوں کرکے رو دیا (ڈینیوب کے سرسبز و شاداب علاقے اور دجلہ و فرات کے صحراؤں میں کافی فرق ہے) واپسی پر اسے یہ اطمینان ضرور تھا کہ وہ پہلا رومن بادشاہ ہے جو اس علاقے میں تہذیب پھیلانے گیا تھا۔

ساسانی اپنے عروج کے لئے کافی عرصے سے منتظر بیٹھے تھے، دجلہ کے کنارے

خسروِ اعظم سفیروں کو اکٹھا کر کے اپنے محل طاقِ کسریٰ میں موجودہ اور گذشتہ عظمت کے قصّے سناتا (سفیروں نے یہ کہانیاں اتنی مرتبہ سنیں کہ انھیں یقین سا ہوگیا کہ سچی ہیں) طاقِ کسریٰ کی محراب اتنی اونچی تھی کہ آج تک اُسے دنیا کی بلند ترین محراب سمجھا جاتا ہے۔ ساسانی بادشاہ سردیاں یہاں گزارتے اور گرمیاں ایران کے پہاڑوں میں۔ جب بادشاہ موسم کے الٹ پھیر میں دار الخلافے بدلنے لگیں تو ضرور کچھ ہو کر رہتا ہے —— چنانچہ عرب آ گئے۔

خالد بن ولید نے تیرہ مہینوں میں پندرہ جنگیں لڑیں اور ہر مرتبہ فتح پائی۔ کچھ ساسانیوں کی خود اعتمادی اور منصوبے بندی انھیں لے ڈوبی —— ہُرمز خالد سے لڑنے آیا تو بے شمار زنجیریں ساتھ لایا تھا تاکہ عرب قیدیوں کو گرفتار کرنے میں آسانی رہے، دجلے کے کنارے ابلہ کے مقام پر نہ صرف شکست ہوئی بلکہ انھیں زنجیروں سے ساسانی باندھے گئے۔

(جنگِ قادسیہ میں ساسانیوں کا کمانڈر مشہور پہلوان رستم تھا۔ سب جانتے ہیں کہ پہلوانی اور چیز ہے اور جنگ اور چیز)

دلیری کا زمانہ تھا اصلی جنگ سے پہلے سنگل ہوا کرتے، کوئی سورما نکل کر مخالف لشکر کو للکارتا —— ہل مبازر منکُم (کوئی ہے جو سامنے آئے) دونوں فوجوں کے سامنے مقابلہ ہوتا۔ یورپ نے نقل شروع کی تو ڈوئل، رائج ہوئی لیکن بعد میں جرمنی کے اخباروں میں ایسے اشتہار نکلنے لگے —— بہادرو! چہرے پر ڈوئل کے نشان لگوانا چاہتے ہو۔ فلاں جراح کی خدمات حاضر ہیں)

بادشاہ لڑتا تو اگلی صف میں ہوتا تاکہ سپاہیوں کے حوصلے بلند رہیں (بعد میں بادشاہ محض اس خیال سے دور رہنے لگے کہ کہیں ان کی موت پر لشکر بددل ہو کر نہ بھاگ نکلے) عرب جلدی میں تھے، وہ آپ کو عراق عرب اور عراق عجم کہہ کر بصرے اور کوفے میں چھاؤنیاں بنا کر شمال کی طرف نکل گئے۔ آرمینیا اور کاکیشیا میں سپاہیوں نے پہلی مرتبہ

سنہرے اور سرخ بالوں والی لڑکیاں دیکھیں (بعد میں کاکیشیا کے پہاڑ کوہِ قاف اور یہ لڑکیاں کوہِ قاف کی پریاں مشہور ہوئیں۔)

عربوں کی سلطنت پھیلتی گئی اور پرانی رومن سلطنت سے بڑی ہوگئی۔

عرب خانہ بدوش تھے اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا خیمہ اُن کے نزدیک بہترین عمارت تھی۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ وہ اپنے خیموں کے لئے عمارتوں کے شہتیر کھینچ لیا کرتے تھے۔ ابن خلدون نے بڑی کام کی باتیں لکھی ہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ آرٹ کبھی تخلیق نہیں ہوتا۔ جب تک کہ آرٹسٹ نہ ہوں اور یہ کہ قوم بننے میں تین پشتوں کا عرصہ یعنی تقریباً ایک سو بیس برس لگتے ہیں۔ فتوحات کھلی ہوا کے رہنے والوں کو شہروں اور قصبوں میں لے آئیں تو وہ پریشان ہوئے (یہ پریشانی بجا تھی آبادیوں میں کاشت کاری ہوتی تھی پانی کی وجہ سے مچھر بہت تھے جن سے بخار چڑھتا تھا)

خلفائے بنو اُمیہ دمشق میں رہے لیکن صحرا اور نخلستانوں کی محبت دل سے نہ گئی شکار یا دورے کے بہانے صحرا میں نکل جاتے، اُن کے صحرائی محلوں کے کھنڈر ابتک موجود ہیں لیکن عباسیوں نے بغداد بسا کر شہری سکونت اختیار کی، آہستہ آہستہ طرزِ تعمیر، بود و باش ہر چیز پر ساسانی رنگ آگیا۔ دیوانِ عام کی جگہ دیوانِ خاص نے لے لی، افسروں سے ملنے کے لئے پہلے درخواست دینی پڑتی تھی اور انکے سامنے درباری آداب کو ملحوظ رکھنا پڑتا تھا۔

بغداد بین الاقوامی شہر بن گیا، ہارون الرشید نے شارلیمین کو ایک کلاک اور ہاتھی بھجوایا۔ (مورخ کہتے ہیں کہ ہاتھی نے ۸۱۰ء میں جرمنی میں انتقال کیا — شارلیمین کا انتقال بعد میں ہوا)

نہر سویز کا خیال سب سے پہلے ہارون الرشید کو سوجھا تھا، موجودہ نہر کی کھدائی سے ہزار سال پہلے اُس نے علاقے کی پیمائش کرائی تھی۔ ہارون نے بازنطینیوں سے لڑائیاں لڑیں — بازنطینی ہر بار صلح کر لیتے اور عرب فوج کے واپس بغداد پہنچنے سے پہلے صلحنامہ

منسوخ کر کے پرانی حرکتوں پر اُتر آتے (شاید اس لئے کہ یہ فاصلہ کئی مہینوں کا تھا) ایرانی سول عہدوں پر تھے، عراقی یا تجار تھے یا طالب علم، اس لئے خلیفہ معتصم نے غیر ملکیوں کو فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا اس نئی فوج کے لئے جو ملوکوں اور وسط ایشیا کے قبائلیوں پر مشتمل تھی۔ ساٹھ میل اوپر دجلے کے کنارے سامرہ آباد کیا گیا جو دارالخلافہ بن گیا۔ مورخوں کا کہنا ہے کہ سامرہ کے ساتھ ہی خلافت کا زوال شروع ہو گیا۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو لیکن آج تک جتنی سلطنتیں قائم ہوئی ہیں دو تین سو برس سے زیادہ نہیں رہیں۔ شاید قدرت نے یہی عمر مقرر کر رکھی ہے اس کے بعد اقتدار کم ہوتا چلا جاتا ہے، بہانے سینکڑوں بن جاتے ہیں، باہمی خانہ جنگی، کسی نئی قوم کا عروج، بعض اوقات کوئی بھی وجہ نہیں ہوتی۔ سلطنتِ روما کے زوال پر کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن اب تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ دراصل کیا ہوا تھا۔

تیرہویں صدی کے وسط میں ہلاکو نے بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے سولہ لاکھ کو قتل کیا، دریا چلتے رہے نہریں بہتی رہیں لیکن ہل چلانے والا کوئی نہ تھا، زمین دوبارہ بنجر ہو گئی (بیسویں صدی کے شروع میں سر ولیم ولکاکس نے حکومت ترکیہ کو رپورٹ بھیجی عراق میں نئی نہریں کھودنے کی بجائے اَٹی ہوئی قدیم نہروں کو درست کرایا جائے) تین سال تک کوئی خلیفہ نہ تھا (آخر خلافت بغداد سے قاہرہ منتقل کی گئی اور وہاں سے قسطنطنیہ اور پھر خلافت ختم ہو گئی) خلافتِ بغداد کو تباہ کر کے ہلاکو کی اولاد پچاس سال کے اندر اندر مسلمان ہو گئی۔

اس کے بعد ایرانی آئے، ترک آئے جو کئی سو برس رہے۔ پھر ایسٹ انڈیا کمپنی نے بصرے میں دفتر کھول لیا پہلی جنگِ عظیم شروع ہوئی تو عربوں کو لڑے کافی عرصہ ہو چکا تھا۔ وہ ترکوں کے خلاف لڑے۔ جب جنرل ایلنبی دمشق میں داخل ہوئے تو خوش فہم باشندوں نے آلِ نبی! آلِ نبی!! کے نعرے لگائے۔ پہلی اور دوسری عظیم جنگوں کے

درمیانی وقفے کے حالات ذرا پیچیدہ ہیں، اُنھیں یا تو سیاست دان سمجھ سکتے ہیں یا اخبار نویس

بغداد کا شہر دجلے کے ساتھ ساتھ یوں چلا گیا ہے کہ اس کے عرض و طول میں ایک اور تیرہ کی نسبت ہے فقط شمالی حصے میں قدیم بغداد کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ورنہ بالکل بغداد الجدید بن چکا ہے ——— پرانی عظمت کی نشانیاں گنی گنائی رہ گئی ہیں، کوئی مینارہ، منہدم محل یا وہ زمین دوز لائبریری جس میں ہلاکو نے دریا کا پانی چھوڑ دیا تھا۔

جغرافیہ دان یعقوبی نے لکھا ہے کہ دورانِ سفر میں خلیفہ منصور ایک گاؤں کے پاس رُکا اور اپنے ہمراہیوں سے کہنے لگا ——— "یہ گاؤں بہت بڑی تجارتی منڈی بن سکتا ہے۔ دجلے کے ذریعے آرمینیا اور آذربائیجان سے سامان آئے گا اور فرات کے ذریعے شام، مصر اور شمالی افریقہ سے ——— ہند اور چین کے جہاز یہاں لنگر انداز ہوں گے، اصفہانی اور خراسانی تجار سڑکوں سے پہنچیں گے، خدا کا شکر ہے کہ ایسے شہر کو آباد کرنا میرے سپرد ہوا ہے ورنہ مجھ سے پہلے کتنے یہاں سے گزرے اور کسی کو خیال تک نہ ہوا ———"

منصور نے دجلے کے مغربی کنارے پر مدینۃ السلام کی بنیاد رکھی، شہر آباد ہوا تو لوگ اُسے منصوریہ کہنے لگے (منصور کا شہر تھا تو دجلے پر لیکن پانی فرات سے آتا تھا) پبلک نے فوراً سٹلائٹ ٹاؤن اور ماڈل ٹاؤن بنائے۔ مشرقی کنارے پر مہدیہ آباد ہوا پھر رصافہ ——— دیکھتے دیکھتے منصور کا اصلی شہر بالکل کھو گیا۔ لفظ بغداد کو کچھ لوگ تو شہروان کے پرانے شہر باغ واد سے ملاتے ہیں کچھ کہتے ہیں کہ یہاں بابل کے وقتوں کا گاؤں بغندادہ آباد تھا۔

جب معتصم نے ڈھائی لاکھ سپاہیوں کے لئے سامرہ بسایا تو بغداد کی اہمیت کم ہو گئی۔

جدید وضع کے سامرہ میں پونے تین سو گز لمبی، پونے دو سو گز چوڑی مسجد تعمیر کی گئی (جسے دنیا کی سب سے بڑی مسجد کہا جاتا ہے) لیکن پھر متوکل نے شمالی سمت میں ایک نیا دارالخلافہ الجعفریہ تعمیر کر دیا تو سامرہ سنسان ہو گیا۔ پھر سب جعفریہ سے سامرہ آ گئے اور وہاں سے واپس بغداد۔

(معتصم کے زمانے میں ہندوستان سے سترہ ہزار جاٹ بغیر بلائے یا اطلاع دئے آ گئے تھے ——— عرب انھیں الزط کہا کرتے تھے۔ جب انھوں نے مار دھاڑ شروع کی تو پکڑ کر سلیشیا کی سرحد پر بھیج دیا گیا ——— کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کے خانہ بدوش انہی الزط حضرات کی اولاد ہیں ——— واللہ اعلم بالصواب!)

بغداد نے بڑی ترقی کی، عرب ملاح دور دور نکل گئے (ان دنوں بھی روس، سویڈن اور جرمنی میں قدیم سکے ملتے ہیں)

یونیورسٹیاں اور دارالحکما قائم ہوئے۔ یونانی علمار کی کتابوں کا ترجمہ ہوا۔ بغداد علوم و فنون کا مرکز بن گیا۔ اس عہدِ زریں کے علمار اور ماہرین کے نام تاریخ کی دھند میں ستاروں کی طرح چمکتے ہیں۔ بیسویں صدی میں سارٹن نے اپنی "تاریخ سائنس" میں الفارابی کو دنیا کا سب سے بڑا فلسفی، ابو کامل (جنھوں نے الخوارزمی کے الجبرے کی تکمیل کی) اور ابراہیم بن سنان کو سب سے بڑے ریاضی دان، المسعودی کو عظیم ترین جغرافیہ دان اور طبری کو سب سے ممتاز مورخ قرار دیا ہے۔ یورپ کی یونیورسٹیوں میں سترھویں صدی تک بوعلی سینا اور رازی کی کتابیں پڑھائی گئیں۔ بوعلی سینا کی کتاب 'القانون فی الطب' کو ڈاکٹر اوسلر نے طبی انجیل کا درجہ دیا ہے۔ اُس زمانے کے جینئس بڑے عظیم انسان ہوتے تھے۔ بیک وقت سائنس دان، مہندس، فلسفی بھی ہوتے تھے، شاعری، موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ پر بھی عبور ہوتا تھا (آج کل کے انٹلکچول حضرات کی طرح نہیں کہ دس بارہ کتابیں پڑھ کر عینک لگائی، بال بڑھائے اور چڑچڑے ہو کر ہر چیز کی مخالفت شروع کر دی!)

بغداد کی دھاک دور دور تک بیٹھ گئی۔ یہاں سے حکمنامے جاری ہوتے تھے۔ خطابات عطا ہوتے تھے شمس الدین التمش نے ہندوستان سے اپنا نمائندہ بغداد بھیجا اور حکومت کرنے کی اجازت مانگی، جب خلیفے نے سیاہ عبا، انگوٹھی اور عصا بھیجے تب سلطان بنا سلجوقوں نے خراسان کو فتح کیا تو خلیفہ نے مبارک باد بھیجی اور یمین الدولہ، امین الملت، کے خطابات عطا فرمائے بعد میں طغرل بیگ کو ملک الشرق والغرب، کا اعزاز دیا۔ سلطان کا خطاب بھی خلیفہ دیا کرتا (لیکن بعد میں لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اعزازات و خطابات محض مغربی قوموں کے ایجاد کردہ ہیں)

کئی سیاح بغداد سے گزرے۔ بارھویں صدی میں ابن جبیر آیا تو اسے گرد و نواح میں جگہ جگہ نہریں اور پل ملے لیکن بغداد اجڑا اجڑا سا معلوم ہوا، باشندے مغرور اور خشک سے لگے لیکن بغداد کے حسن سے بہت متاثر ہوا۔ یہاں حسن کی وہ فراوانی ہے کہ خوف خدا نہ ہو تو انسان فوراً غلط راستے پر پڑ سکتا ہے (ابن جبیر)

مارکوپولو نے موصل کے تجاروں کو مسولینی لکھا ہے (اطالوی بعد کی چیز ہے) بغداد کو بوداز بصرے کو بلصرہ اور ہلاکو کو الاؤ، مارکوپولو نے جو الاؤ کے حملے اور بوداز کی تباہی کی داستان لکھی ہے وہ آج کل کے تاریخی ناولوں کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔

الاؤ نے جب بوداز میں ایک اونچا مینار دیکھا جو سونے سے بھرا ہوا تھا تو خلیفے سے گویا ہوا ——— "افسوس! کہ آپ نے لالچ کیا اتنے سونے سے تو آپ ایک زبردست فوج رکھ سکتے تھے۔ اب میں آپ کو اسی مینار میں بند کر دوں گا۔ تاکہ سونا دیکھتے دیکھتے آپ کا انتقال ہو جائے" ——— چنانچہ ایسا ہی ہوا۔" (مارکوپولو)

اس نے ایک معجزے کا ذکر بھی کیا ہے ———

یہ آخری خلیفہ طرح طرح کے بہانوں سے عیسائی رعایا پر ظلم توڑتا معقول

بہانے ختم ہو چکے تو اپنے علما کو بلا کر نئے بہانے تلاش کرنے کا حکم دیا، انھوں نے عیسائیوں کی مقدس کتاب سے یہ فقرہ نکالا ——— "اگر تمھارا ایمان رائی کے دانہ کے برابر بھی ہے تو پہاڑ کو اس کی جگہ سے ہٹا سکتے ہو۔" ——— خلیفے نے عیسائیوں کو اکٹھا کرکے حکم دیا کہ یا تو مذہب ترک کردو۔ یا دسویں روز اس پہاڑ کو ہٹا کر دکھاؤ (بغداد کے آس پاس چھوٹی سی پہاڑی تک نہیں ہے) عیسائی بہت گھبرائے آخر امید کی کرن نظر آئی اور وہ سیدھے ایک موچی کے پاس گئے جو کانا تھا، اور زہد و تقویٰ کے سلسلے میں آنکھ گنوا چکا تھا، اس نے عبادت کی اور وقت مقررہ پر ہجوم کے سامنے دعا مانگی، پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ گیا (تب ہی بغداد میں پہاڑ نہیں رہے) یہ "معجزہ" دیکھ کر لاتعداد مسلمان عیسائی ہو گئے، پوشیدہ طور پر خلیفہ بھی عیسائی ہو گیا کیونکہ جب اس کا انتقال ہوا تو پوشاک اتارتے وقت گلے میں لٹکی ہوئی صلیب ملی ——— مارکو پولو نے یہ دروغ نویسی تیرھویں صدی میں کی تھی (اور اس کے باوجود مغرب میں ابن بطوطہ کے سفرنامے کو شک و شبہہ کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے) ابن بطوطہ چودھویں صدی کے شروع میں آیا، پہلے بصرہ پہنچا پھر خلیج فارس کے ساحل پر، بغداد کا ارادہ کیا تو معلوم ہوا کہ بصرے والی سڑک سے دوبارہ گزرنا ہوگا۔ "جس راستے سے ایک دفعہ نکل جاؤں اس سے دوبارہ نہیں گزرتا"۔ ——— (ابن بطوطہ) لہذا مجبوراً ایران کی طرف سے سینکڑوں میل کا فالتو چکر لگا کر بغداد پہنچا، وہاں جاکر دیکھا کہ قدیم عمارات منہدم ہو چکی ہیں اور لوگوں نے غلط عربی بولنی شروع کردی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیا کہ تاتاری اور ترک حکمران فرمان جاری کرتے ہیں تو اس طرح شروع کرتے ہیں ——— سلطان فلاں اور خاتون (بیویوں) کے حکم سے جاری ہوا ———، (جیسا کہ دورِ جدید میں ہوتا ہے)

ابن بطوطہ جیسا سیاح آج تک پیدا نہیں ہوا۔ ایک دن گھر سے سیر کرنے نکلا تو چوبیس سال تک سیر کرتا رہا، مشرق وسطیٰ، ہندوستان، لنکا، چین، قسطنطنیہ، وسط ایشیا

دیکھ کر واپس گھر پہنچا تو یاد آیا کہ اسپین اور افریقہ کے اندرونی حصے رہ گئے ہیں، چھ برس کے لئے پھر نکل گیا۔

بغداد میں ان دنوں دو سلطان دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں بغداد کا اتنا ذکر نہیں کیا جتنا سلاطین اور ان کے لڑائی جھگڑوں کا۔ ایک دن وہ سلطان ابوسعید (جس کی بیوی کا نام بغداد خاتون تھا) کے محلے کے ساتھ چل کھڑا ہوا (محلہ چلتے پھرتے کیمپ کو کہا جاتا تھا) سیاحت کے دوران میں اس نے لیکچر دیئے، ملازمتیں کیں، بادشاہوں کا سفیر بنا، شادیاں کیں، لیکن جہاں اسے کوئی قافلہ نظر آجاتا عہدہ، رتبہ، دولت ــــــ سب چھوڑ چھاڑ کر ساتھ ہو لیتا۔

میں اور دو مقامی حضرات واپس کیمپ آرہے تھے یکایک انھوں نے گھبرا کر نعرہ لگایا ــــــ "ہم سب خطرے میں ہیں بڑی مصیبت آنے والی ہے" اور دوڑ کر ٹیلے کے پیچھے چھپ گئے، چاروں طرف دیکھا کچھ بھی نظر نہ آیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ کسی اونچی جگہ سے دیکھتے ہیں۔ "مت جاؤ خطرہ ہے" وہ دونوں چلائے۔ ایک جگہ سے ساری وادی سامنے آگئی سامنے کچھ درخت اور خیمے تھے، ایک طرف سے غبار سا اٹھا۔ نعروں کی آوازیں آئیں اور گولیاں چلنے لگیں، پھر ریت کے بادلوں میں سب کچھ چھپ گیا۔ چند شہسوار بندوقیں سنبھالے تیزی سے ایک طرف نکل گئے۔ اور غدر سا مچ گیا۔ پھر اونٹ اور شہسوار دوسری طرف جاتے نظر آئے۔ چند گولیاں چلیں اور شہسوار اور بھیڑیں دکھائی دیں کبھی اونٹ اور آدمی سامنے آجاتے، کبھی بھیڑیں اور آدمی تو کبھی اونٹ اور بھیڑیں ــــــ ساتھ ساتھ نعرے اور گولیاں ــــــ پھر یہ سب آپس میں خلط ملط ہو گئے۔

جب گرد صاف ہوئی تو ایک طرف اونٹ کھڑے تھے دوسری طرف بھیڑیں اور آدمی گھوڑوں کو تھپتھپا رہے تھے، نہ کوئی زخمی نظر آیا نہ کسی کا انتقال ہوا تھا۔

واپس جاکر اپنے ساتھیوں کو سنبھالا جو ابھی تک تھر تھر کانپ رہے تھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جان بچ گئی ـــــ ابھی دو قبیلوں میں لڑائی ہوئی تھی ـــ

کیمپ پہنچکر یہ واقعہ منصور کو سنایا، وہ حقارت سے بولا۔ "شہری ہوں گے، ان لوگوں کو لڑنا بھی نہیں آتا۔ کبھی پہاڑ والوں کی لڑائی دکھائیں گے ـــ تم یقیناً خوش ہو گئے۔"

شام کو منصور بھی ہمارے ساتھ بغداد گیا کیونکہ آج خاص پروگرام تھا، پبلک کے پر زور اصرار پر عفیفہ مجید اپنے مشہور نغمے سنانے والی تھی۔ وہ مائیکروفون کے سامنے آئی تو خوب تالیاں بجیں، لیکن اس کے بعد جو کچھ ہوا اس میں گانا کم تھا ملکنا تھرکنا زیادہ۔ عفیفہ مجید کی صحت ماشاءاللہ بہت اچھی تھی اور لباس ضرورت سے زیادہ چست۔ بازو تھرکتے گردن ہلتی کمر لچکتی سارا جسم بل کھا رہا تھا ـــ کبھی کبھی چھوٹا سا مصرعہ زبان پر آتا ـــ "کیا جذبات ہیں! کیا اظہار ہے!! واللہ ـــ" جرجیس جھوم جاتا۔

اتنے میں دو شیخ اونٹوں سے اترے گانی والی کو کچھ دیر غور سے دیکھا ہاتھ ملا کر نعرہ لگایا اونٹوں پر سوار ہو گئے

"انھوں نے کیا کہا تھا؟" روز نے پوچھا۔

"اطمینان کا اظہار کیا تھا کہ الحمدللہ عفیفہ مجید ابھی تک فربہ ہے"

"ضرور دیہاتی ہوں گے ـــ" ایک طرف سے آواز آئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا سلیم چند خونخوار سے لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ علیک سلیک کے بعد وہ سب ہماری پارٹی میں شریک ہو گئے۔ "اس پہاڑی کا قصہ تو سنا ہو گا جو عبادت کر رہا تھا کہ کوئی مسافر نظر آ گیا، اس نے فوراً بندوق سنبھالی، عبادت ملتوی کی اور مسافر کو لوٹ لیا۔ کوئی مہذب شخص دیکھ رہا تھا اس نے برا بھلا کہا تو پہاڑی خفا

ہو کر بولا ——— "یہ دین کا کام ہے وہ دنیا کا ——— دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں ———"

سلیم کے دوستوں نے قہقہہ لگایا۔

"جی ہاں یہ قصہ میں نے سنا ہے۔" منصور نے جواب دیا۔ "دو اور شہروں میں یہ قتل قاتلوں مقتولوں کی گردان بھی سنی ہے۔ ایک شہری کسی پہاڑی کو چائے خانے میں لے گیا اور اپنے دشمن کی طرف اشارہ کر کے بتایا کہ وہ ہے جو چار دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہے ——— پہاڑی نے وضاحت چاہی تو شہری نے بتایا کہ دشمن کی مونچھیں سیاہ تھیں۔ وہ جو موٹا اور گنجا ہے ——— لیکن وہ پانچوں موٹے اور گنجے تھے ——— آخر دیہاتی کو دشمن دکھانے کے لئے شہری نے پستول نکالا، ڈز ڈز کی آوازیں آئیں چشم زدن میں چار آدمی مرے پڑے تھے ——— وہ جو رہ گیا ہے وہ میرا دشمن ہے ——— اب سمجھے" اب قہقہہ لگانے کی باری تھی۔ لیکن کچھ بدمزگی سی پیدا ہو گئی۔ عفیفہ مجید کا گانا ختم ہو چکا تھا، آرکسٹرا بج رہا تھا اور لوگ رقص کر رہے تھے۔ منصور اور سعدہ کو وہیں چھوڑ کر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

روزنہ تین لڑکیاں لئے چلا آرہا تھا، ان میں لوئی زا بھی تھی۔

"یہ کیا ———؟" میں نے آہستہ سے پوچھا۔

"دو سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

جرجیس لپک کر آگے بڑھا لیکن روزنہ نے جلدی سے لوئی زا کا ہاتھ پکڑا اور رقص کرنے چلا گیا۔

"جس لڑکی کو دیکھو کسی یورپین پر فریفتہ ہے ———" جرجیس نے جھلّا کر کہا۔

"اتنی دیر کسی اور کے ساتھ ناچ لو" میں نے مشورہ دیا۔

وہ غم غلط کرکے آیا تو لوسی زا پر برس پڑا ـــــ "یہ کیا حرکت تھی؟"

"حرکت ورکت کچھ نہیں تھی ـــــ ناچنا ہے تو ناچو ورنہ راستہ لو ـــــ"

جرجیس یکلخت خوش ہو گیا ـــــ جانتی ہو میں ہر وقت تمہیں یاد کرتا رہتا ہوں۔

"قاسم بھی یہی کہتا ہے ـــــ"

"لیکن میں قاسم سے کہیں پہلے اٹھتا ہوں اور آدھی رات تک جاگتا رہتا ہوں

ـــــ قاسم کون ہے؟"

"یہ دیکھو ـــــ"، اس نے ہاتھ سامنے کر دیا۔ ایک انگلی میں انگوٹھی چمک رہی تھی۔

"انگوٹھی تو غلط انگلی میں ہے ـــــ"، لولیتا نے کہا۔

"منگنی بھی تو غلط آدمی سے ہوئی ہے ـــــ لیکن اگر یہی بات تھی تو تم نے مجھے غلط امیدیں کیوں دلائیں! اتنے دن میرے ساتھ ساتھ کیوں پھر اکیں؟"

"میں قاسم کی محبت آزما رہی تھی ـــــ"

"اس وقت تم دو انسانوں کو بے وقوف بنا رہی ہو، اور ان میں سے ایک تم خود ہو ـــــ"۔ ان کی تو تو میں میں شروع ہو گئی۔

منصور ابھی تک بحث میں مشغول تھا۔ سعدہ بھی وہیں بیٹھی تھی ـــــ

منصور کہہ رہا تھا ـــــ "ہمارے یہاں پنچایتیں منٹوں میں فیصلے کر دیتی ہیں تمہاری خفیہ پولیس کی طرح نہیں کہ دو سال تک مقدمے کی تفتیش کرتے رہے اور آخر میں لکھ دیا ـــــ پوری تحقیقات کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دال میں کچھ کالا ہے ـــــ"

سلیم کا ایک خونخوار سا دوست بولا ـــــ "تمہارے امن و انصاف کی کیا بات ہے۔ کسی پہاڑی نے اپنے ہمسائیوں کی رحم دلی اور ایمانداری کی تعریفیں کیں

جب پوچھا گیا کہ ہاتھ میں بندوق لئے کیوں پھرتے ہو تو بولا ــــ "ہمسایوں کو رحمدل اور ایماندار رکھنے کے لئے ــــ"

موسیقی شروع ہو گئی، ہم نے لوی زا سے درخواست کی کہ جرجیس کو منالے۔ وہ اسی وقت خوش ہو گیا ــــ

"تم جو محبت کرتے رہتے ہو، بتاؤ مجھے کتنا چاہتے ہو؟"

"بہت زیادہ ــــ اتنا کسی نے کسی کو نہ چاہا ہوگا ــــ"

"میرے لئے جان دے دوگے؟"

"میری محبت غیر فانی ہے ــــ"

روز آیا اور لوی زا کو رقص کے لئے لے گیا۔

"دیکھا تم نے؟ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ تم میں مشرقیت نام تک کو نہیں ــــ"

اب وہ مجھ پر خفا ہونے لگا۔

"انگریزی انگریزوں کی طرح بولتے ہو ایک لفظ سمجھ میں نہیں آتا چائے انگریزوں کی طرح پیتے ہو، چھوٹے سے پیالے سے آدھ گھنٹہ کھیلتے رہتے ہو ناچتے بھی انہی کی طرح ہو رقص نہ ہوا پریڈ ہو گئی اور تمھارا نظریہ حیات بھی انہی سے ملتا ہے ــــ"

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ روز ہر بار اسے چھین لے جاتا ہے اور تم کچھ نہیں کہتے ۔۔"

"جرجیس! تمھارے نام سے نسوانیت ٹپکتی ہے اور ویسے بھی تم میں مردوں والی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ہمارے یہاں جرجیس لڑکیوں کا نام ہوتا ہے ــــ"

"مگر لوی زا ــــ"

"مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس لڑکی کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور ہیں جن میں سے چند تو بالکل غلط ہیں ــــ"

"سعدہ نے کہا ہوگا ـــــ" وہ سعدہ کی طرف لپکا۔
لیکن وہ بحث بدستور جاری تھی۔
"دو دریاؤں کا یہ ملک لا دواب ہے ـــــ"
"ہر ملک میں دو قسم کے باشندے ہوتے ہیں۔ دیہاتی اور شہری" منصور بولا
"دراصل دو مختلف قومیں ایک جگہ رہتی ہے ـــــ"
"آپ بھی تو کچھ کہئیے، ہند کا کیا حال ہے۔؟" سلیم کے ایک دوست نے مجھ سے پوچھا۔
"ہند میں کئی صوبے ہیں اور ہر صوبے میں کم از کم چار یا پانچ دریا ہیں جو آپ کے دو دریاؤں سے کہیں چوڑے اور تیز ہیں ـــــ"
"لیکن آپ کے یہاں نہ دجلہ ہے نہ فرات"
"انھیں یہ بھی بتاؤ" منصور بولا "کہ وہاں جب لوگوں کو جوش آتا ہے تو جلوس نکالتے ہیں پھر کھلے میدان میں تقریریں ہوتی ہیں۔ نعرے لگا کر اور پیدل چل کر اتنے تھک جاتے ہیں کہ گھروں میں جا کر سو رہتے ہیں، یہاں کے شہروں کی طرح نہیں کہ جب کچھ ہونا ہو تو پہلے سناٹا سا چھا جاتا ہے لوگ ایک دوسرے کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں پھر دفعتاً کوئی ایسی حرکت کر بیٹھتے ہیں کہ مدتوں پچھتاتے رہتے ہیں ـــــ"
سعدہ گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی ـــــ اور سب کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ دور کونے میں جرجیس غم غلط کر رہا تھا ـــــ "سعدہ سے باتیں ہوئیں؟" اس نے پوچھا، میں نے بتایا کہ اب تک مباحثہ ہوتا رہا ہے۔
"شام کو مجھے ملی تھی ـــــ اس نے میرا حال پوچھا میں نے بتایا، پھر تمہارا پوچھا تو میں نے اپنا حال بتایا ـــــ"
"جرجیس سب دوستوں کی یہی خواہش ہے کہ لوی زا سے تمہاری شادی ہو جائے،

وہ تمہارے دکھ درد میں شریک ہو، مایوسیوں میں ہمت بندھائے، تمھارا غم ہلکا کرے۔"

"لیکن مجھے تو کوئی غم نہیں ——" وہ چونک کر بولا۔

"شادی کے بعد کا ذکر کر رہا ہوں ——"

"تو پھر سعدہ سے ملاقات نہیں ہوئی ——؟"

"نہیں"

"چلتے وقت لوی زا نے ایک کاپی نکالی —— "اس پر کچھ لکھ دیجئے ——"

میں نے ورق الٹے طرح طرح کی زبانوں میں عجیب عجیب فقرے لکھے ہوئے تھے۔ ایک صفحے پر، ایمانداری بہترین شے ہے، تھا تو دوسرے پر، ہائے لوی زا درج تھا۔ کاپی واپس کی تو حیران ہوئی ——

"بات یہ ہے کہ مجھے ہجوم سے چڑ ہے ——"

"اچھا ہم کسی اور ہندی سے لکھوا لیں گے"، وہ اٹھلاتی ہوئی چل دی۔

جرجیس بھاگا بھاگا آیا —— "یہ کیا کہہ رہی تھی؟"

"کچھ نہیں!"

"تو گویا سعدہ سے باتیں نہیں ہو سکیں —— "جرجیس تقریباً تقریباً آدٹ ہو چکا تھا۔

لاری کیمپ کی طرف جا رہی تھی۔ موہن اور میں باتیں کر رہے تھے۔۔۔ خان صاحب —— ایک مشورہ دوں۔ یہ لوگ یہاں رہتے ہیں یہیں رہیں گے، ہم پردیسیوں کو محبت نفرت کے چکر میں نہیں پڑنا چاہئے۔ آپ ناتجربہ کار ہیں میں کافی اونچ نیچ دیکھ چکا ہوں جہاں ایک انسان سے محبت ہوتی ہے وہاں دس بارہ سے خواہ مخواہ نفرت کرنی پڑتی ہے اور نفرت بیحد ذلیل چیز ہے مہینوں برسوں نفرت کئے جاؤ دشمن کے سر میں درد تک نہیں ہوتا الٹا اپنے سر میں ہو جاتا ہے۔"

اگلے دن ہم اپنے خیمے میں تاش کھیل رہے تھے باہر ہلکی ہلکی بوندیں پڑ رہی تھیں خیمے کا پردہ اٹھا اور جرجیس جھانکنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں تصویروں کا پلندہ تھا —— چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور آنکھوں میں خمار ——

"اس تصویر میں ہم چاروں ایک دوسرے کے کندھے پر ہاتھ رکھے مسکرا رہے ہیں —— لیکن یہ تصویر کیمپ میں لی گئی تھی، بغداد میں اتاری جاتی تو ایک دوسرے کی کمر میں خنجر بھونکتے ہوئے نظر آتے ——"

"کیا ہوا؟" سب حیران رہ گئے۔

"میں بغداد سے آ رہا ہوں، جو جو باتیں سنی ہیں تم سب سے نفرت ہو گئی ہے۔"

"کس سے سنیں؟"

"لڑکیوں سے" وہ چلّا کر بولا

اسے بہتیرا چپ کرانے کی کوشش کی لیکن واہی تباہی بکے گیا۔ آخر مجھے غصہ آ گیا۔ میں نے وہ تصویریں باہر پھینک دیں۔ اس نے ہر ایک کو باری باری گھورا اور فوراً باہر نکل گیا۔ میں نے پردے سے جھانک کر دیکھا، وہ جھکا ہوا تصویریں اکٹھی کر رہا تھا —— ایک ایک تصویر کو اٹھا کر رومال سے پونچھتا اور جیب میں رکھ لیتا۔

مجھے بڑا ترس آیا لیکن سب خاموش تھے میں نے بھی کچھ نہ کہا۔ جرجیس سے بول چال ختم ہو گئی، اسے دیکھ کر راستہ کترا جاتے —— پہلا دن گزرا، پھر دوسرا، تیسرا، چوتھے روز وہ خیمے میں آیا، ہمیں سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔

"تین دن میں یہی سوچتا رہا کہ دوستوں کو میری کمی محسوس ہو گی مجھے منا لیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا اب معافی مانگنے آیا ہوں ——"

شاید اس واقعے کی اطلاع برٹن تک پہنچ گئی، سنیچر کی شام کو جب ہم بغداد کے نہ جانے کی بجائے کیمپ کے دجلے کو دیکھ رہے تھے تو وہ بولا —— "ایک لڑکی کے لئے

چند مرد آپس میں لڑیں تو جائز ہے لیکن اگر تین چار لڑکیاں ایک دوسری سے جل کر تین چار مردوں میں ناچاقی کرا دیں تو قصور مردوں کا ہے۔ بعد میں یہی لڑکیاں آپس میں ملیں گی تو فوراً شیر و شکر ہو جائیں گی، مرد بے وقوفوں کی طرح دیکھتے رہ جائیں گے۔ لڑکیوں سے فالتو باتیں مت کیا کرو۔ آج تک خبریں براڈکاسٹ کرنے کے تین طریقے ایجاد ہوئے ہیں ——— ریڈیو سے نشر کرنا، تار بھیجنا اور عورتوں کو بتا دینا ———۔

برٹن نے سب کو بلایا ——— "تم میں سے کسی ایک کو کچھ عرصے کے لئے دُور صحرا میں کام پر جانا ہوگا ——— کون جائے گا؟" سب میری طرف دیکھنے لگے، میں نے ہاں کہہ دی اور اگلے روز نئی جگہ پہنچ گیا، یہ اصلی صحرا تھا جہاں میلوں تک ویرانی ہی ویرانی تھی، اوپر مٹیالہ آسمان نیچے ریت، اکے دکے جھلسے ہوئے درخت جھاڑیاں ——— اور ہُو کا عالم!

میرے ساتھ جو پندرہ بیس آدمی تھے وہ کبھی کبھی باہر جاتے تو یہ دائمی سکوت ٹوٹتا، ایک پگڈنڈی قریب سے گزرتی تھی، ہم سب راہ گیر کی امید لگائے اسے دیکھتے رہتے پھر جب لاری ضروری چیزیں لاتی تو کچھ رونق ہو جاتی۔ چاروں طرف ہولناک سناٹا تھا اور دلدوز خاموشی جو میرے لئے بالکل نئی تھی۔

آہستہ آہستہ میں صحرا اور تنہائی سے مانوس ہوتا گیا، دور دور آبادیاں تھیں وہاں جانے لگا۔ صحرا کے اصلی باشندوں کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تب معلوم ہوا کہ جسے میں اجاڑ ویرانہ سمجھتا رہا تھا وہاں زندگی اور روئیدگی کی کمی نہ تھی۔ جہاں ریت تھا وہاں چند فٹ نیچے اچھی بھلی زمین تھی کہیں سرخ، کہیں بھوری اور سیاہ چٹانیں تھیں کہیں لاوے کے تودے تھے تو کہیں سوکھے ہوئے نالوں کی گزرگاہ، سراب دیکھ دیکھ کر بہر

نظارے سے اعتقاد اٹھ جاتا ـــــ کبھی بہتے ہوئے دریا دکھائی دیتے کبھی موجیں مارتا ہوا سمندر، جھیلوں کی سطح پر درختوں کا عکس نظر آتا ـــــ لیکن یہ سب دور دور رہتے قریب جاؤ تو آگے چلے جاتے، میلوں تک یہ دوڑ جاری رہتی۔

کبھی افق سے سیاہ بادل اٹھتا اس سے پہلے کہ آندھی کا شبہہ ہو نصف سے زیادہ آسمان تاریک ہو جاتا سیاہ بادل اٹھلاتے کھیلتے یوں نظر آتے جیسے کسی کے ہاتھ سے بے شمار غبارے چھوٹ گئے ہوں، ٹیلوں سے بگولے اٹھتے اور چاروں طرف ستون ہی ستون اگ آتے سیٹیاں بجاتے ہوئے تیز جھونکے پہلے ستونوں کو منہدم کرتے پھر ملبہ بھی غائب ہو جاتا۔ یہاں سے وہاں تک تیرہ و تاریک پردہ پھیل جاتا، بھورے بھورے فوارے ابلتے اور ریت کی پھواریں پڑتیں، پردہ ہٹتا تو متلاطم سمندر میں سورج کی ٹکیا تیزی سے تیرتی ہوئی دکھائی دیتی۔ طرح طرح کی شکلیں اور ہیولے نظر آتے ـــ ایک سمت میں بھاگتا ہوا ہجوم، کانپتی ہوئی عمارتیں، تھرتھراتا جنگل، ـــــ جھگڑوں کی چیخیں اور گریہ زاری، کبھی یوں لگتا جیسے زلزلے سے کائنات کانپ رہی ہے کبھی ذرا سی دھند رہ جاتی، ابھی کچھ نظر آیا ابھی غائب ہو گیا ـــــ یہ ڈراونا طوفان جس تیزی سے آتا اسی طرح اتر جاتا' دفعتاً ٹیلے، افق، آسمان سب نظر آنے لگتے اور ذرا سی دیر کے بعد سب کچھ ساکن ہو جاتا، یقین نہ آتا کہ ابھی ابھی آندھی آئی تھی ـــــ

صحرا فقط دو تین ملکوں میں ہی نہیں ہیں دنیا کا ایک کروڑ مربع میل علاقہ صحرا ہے۔ دن میں درجہ حرارت ایک سو تیس پینتیس ہیٹنگ ہو جائے لیکن راتیں بیحد خوشگوار ہوتی ہیں۔ دن بھر جانور غاروں اور بلوں میں چھپتے رہتے ہیں سہ پہر کو جب دھوپ پھیلی پڑتی ہے تو ہل چل مچ جاتی ہے گلہریاں جھانکتی ہیں پرندے نکل آتے ہیں۔ پھر سب کچھ سنہرا ہو جاتا ہے ریت کے ٹیلے، آسمان اور سورج کی کرنیں ـــــ ہر طرف سونا برسنے

لگتا ہے۔ غروب آفتاب اپنی تمام سادگی کے باوجود بیحد حسین ہوتا ہے پہلے بڑی سی چمکیلی گیند کسی جھاڑی میں الجھ جاتی ہے پھر یکلخت کوئی اسے نیچے کھینچ لیتا ہے اگر بھولا بھٹکا بادل مغرب سے گزر رہا ہو تو شفق پھوٹتی ہے۔ تارے نکلتے ہیں، لرزتے، ٹمٹماتے سہمے سہمے سے۔ پھر ایسا وقفہ آتا ہے جس میں یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ شام کا دھندلکا ہے یا صبح کاذب کے وقت آمد آفتاب کی نوید۔ کچھ دیر کے بعد زمین و آسمان روشن ہو جاتے ہیں، پہلے بڑے بڑے تارے مشعلوں کی مانند اپنے گرد ہالا بناتے ہیں پھر لاتعداد ننھے منے تارے خودرو پھولوں کی طرح ہر طرف نکل آتے ہیں۔ جوں جوں رات بڑھتی ہے یہ جگمگ جگمگ کرتا ہوا چراغاں زمین سے قریب تر ہو جاتا ہے جیسے ہاتھ بڑھاؤ اور تاروں کو چھولو۔ سب تارے روپہلے نہیں ہوتے، کئی نیلے ہوتے ہیں کئی سبز تو کئیوں سے سرخ رنگ جھلکتا ہے۔ تب سارا صحرا آباد ہو جاتا ہے طرح طرح کی آوازیں آتی ہیں، ہر طرف زندگی ہی زندگی ہوتی ہے۔ آسمان کا نور چکنے، پتھروں اور ریت کے ذرّوں سے منعکس ہوتا ہے تو تاحد نظر روشنیاں نظر آتی ہیں، ساکن روشنیاں، ٹمٹماتی جھلملاتی روشنیاں، کچھ ایسی قندیلیں جو بجھ بجھ کر روشن ہوتی ہیں۔ اگر چاند ہو تو چاندنی طرح طرح کے روپ ..... دھارتی ہے، آج کی محزون سی غمزدہ سی چاندنی نے تاروں کو بھی اداس کر دیا، تو کل چمکیلی جگمگاتی چاندنی تاروں سمیت نظارے پہ اس طرح چھائے گی کہ نہ افق کی تمیز رہے گی نہ زمین و آسمان کی، سب ایک ہو جائیں گے۔ کسی دن چنچل سی مست چاندنی فضاؤں کو مخمور کر دے گی جادو بے حس چیزیں رقصاں ہو جائیں گی۔

افق پر تنہا کھجور کا درخت، بادل کا ٹکڑا، ڈوبتا یا ابھرتا چاند، ٹیالی اجڑی اجڑی سی رات اور اس کے بے نور چاند ستارے ـــــ یہ تصویریں ذہن میں یوں محفوظ ہو جاتی ہیں کہ مدتوں پچھلے پہر ایک دھند سی چھا جاتی ہے۔ آنکھیں پھر سراب دیکھتی ہیں، یہ کبھی برسنے والی گھٹا معلوم ہوتی ہے کبھی سلسلۂ کوہ تو کبھی اس کے پیچھے آبادیاں نظر آتی ہیں۔

ستارۂ صبح کے طلوع ہونے پر جو نور مغرب میں جا سمایا تھا مشرق سے ہویدا ہوتا ہے نسیم سحری آہستہ آہستہ سارے ستاروں کو بجھا دیتی ہے، ایک مرتبہ پھر صحرا میں ہلچل مچتی ہے پرندے فضاؤں میں زقندیں بھرتے ہیں، ہرن اوس چاٹتے ہیں، جاندار دن بھر کی قید کی تیاریاں کرتے ہیں۔

ایک ٹیلے کے عقب سے سورج جھانکنے لگتا ہے، بیحد دلکش اور سہانی صبح جلوہ گر ہوتی ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس نے یہ سب تخلیق کیا تھا وہ دیکھ رہا ہے۔

جب جنگلوں، پہاڑوں اور آبادیوں میں دن چڑھتا ہے اور مخلوق جاگتی ہے تو صحراؤں میں خاموشی چھا جاتی ہے تپش بڑھتی جاتی ہے اور سہ پہر تک جمود طاری رہتا ہے

لیکن دن بھر کی کلفتوں کا انعام صحرا کی رات ہے ـــــ ایسی رات اور کہیں نہیں آتی

ویرانے کو البادیہ کہتے ہیں اور جو ویرانوں میں گھومتا ہوا نظر آجائے وہ لازمی طور پر البادہ یا البدوی ہوگا لیکن بدوؤں کو یہ نام پسند نہیں وہ اپنے آپ کو عرب کہتے ہیں۔ بدو کی زندگی کافی کٹھن ہوتی ہے، ماہرین کی رائے ہے کہ اس کی غذا بیحد قوت بخش ہے، لیکن اگر ماہرین کو عمر بھر اونٹنی کے دودھ اور کھجوروں پر گزارا کرنا پڑے تو شاید اپنی رائے بدل دیں گرمیوں میں جب صحرا تنور کی طرح دہکتا ہے تو بدو کو اتنی پروا نہیں ہوتی مگر سردیوں میں جب منجمد کر دینے والی ہوا چلتی ہے تو بہت گھبراتا ہے کیونکہ اس کے پاس گرم کپڑے نہیں ہوتے، تب ہی وہ مضبوط اور سخت جان ہوتا ہے۔ کوئی بدو کمزور یا دہمی ہو تو صحرا میں نہ وٹامن کی گولیاں مل سکتی ہیں نہ مقوی معجون ـــــ چنانچہ جو بدو بیماریوں سے بچ جائیں وہ واقعی تگڑے ہوتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ بدو محض تفریحًا خانہ بدوشی پر تلے رہتے ہیں حالانکہ گرمیوں میں سارے قبیلے کنوؤں چشموں اور نخلستانوں کے گرد محض ضرورتًا جمع ہوتے ہیں اور سردیوں میں بھیڑوں اور اونٹوں کی خاطر چراگاہوں کا طواف کرنا پڑتا ہے۔

لڑائی جھگڑا زیادہ طور پر گرمیوں میں ہوتا ہے کیونکہ ہر قبیلہ جانتا ہے کہ دوسرے قبیلے کہاں سے پانی لیتے ہیں چنانچہ اس موسم میں سردیوں کے تنازعے چکانے کا موقع ملتا ہے۔ ویسے موسم بیشک تبدیل ہو جائے لیکن گرمیاں آفیشلی تب ختم ہوتی ہیں جب علی الصبح سہیل نظر آنے لگتا ہے سب ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ایک اور گرمی بخیر وعافیت گزر گئی۔

بدوؤں کی شاعری اور موسیقی عموماً جنگ سے متعلق ہوتی ہے مثلاً
آدھی رات کی ہوائیں چمکتے ہوئے تارے مجھے جانتے ہیں
صبح کاذب کا اجالا، تپتا ہوا سورج اور باد سموم مجھ سے آشنا ہیں ـــــ
پگھلتی چٹانیں اڑتی ریت اور نخلستان کا سبزہ میرے گھوڑے کے سموں کو پہچانتے ہیں

اس گیت سے یہ پتہ چلانا مشکل ہے کہ اشعار کسی جنگجو نے کہے ہیں یا بے قرار عاشق نے (اگرچہ عشق کے سلسلے میں کافی خون خرابا ہوتا ہے) صحرا میں تحریری ریکارڈ نہیں رکھا جا سکتا اس لئے اپنے نام کے ساتھ بزرگوں اور اولاد کا ذکر بھی کیا جاتا ہے تب ہی نام لمبے ہو جاتے ہیں (مجھے وہ ہندی یاد آ گئے جو یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کہیں باہر سے آئے ہیں اس قسم کے نام رکھتے تھے ـــــ دس برس کا لڑکا ابو جعفر یعنی جعفر کا باپ تھا اور غیر شادی شدہ لڑکی اُم طاہرہ جعفری یعنی طاہرہ کی ماں)

بدوؤں کے یہاں کہاوتوں کا استعمال بہت ہوتا ہے، کسی بات پر زور ڈالنا ہو تو پہلے ایک آدھ قصہ ضرور بیان کریں گے مثلاً ـــــ کسی نے اونٹ کو بددعا دی کہ خدا کرے تجھے چور لے جائیں، اونٹ بولا بیشک لے جائیں اپنا کیا ہے ہر جگہ محنت کرنی ہے اور گھاس کھانی ہے ـــــ میں نے بھی ایسی ہی طبیعت پائی ہے جس حال میں ہوں خوش رہتا ہوں" ویسے ان کی کہاوتوں میں بڑی بے ساختگی ہے ـــــ دشمن کنوئیں کے قریب کھڑا ہو تو اسے دھکیل دو ـــــ

"میرے دشمن کا دشمن میرا عزیز دوست ہے"، "کتے کو بیٹھو تو شیر دم ہلانے لگتا ہے"، "بابل کا مینار اس لئے تباہ ہوا تھا کہ اس کے گرد شہر آباد تھا"، "دشمن کو ہمیشہ خوار کرو اگر نہیں کر سکتے تو حالات بہتر ہوتے ہی ذلیل کرو"، دوران گفتگو میں کوئی انکساری دکھائے اور اپنے آپ کو الفقیر کہے تو فوراً اسے جنابکم کہنا پڑتا ہے۔

کسی کے یہاں لڑکا پیدا ہو جائے تو لوگ افسوس کرنے آتے ہیں اور یہ فقرہ کہتے ہیں ــــ "اللہ تعالیٰ اگلی مرتبہ آپ پر کرم فرمائے"! دوسرے ملکوں کے متعلق ان کی معلومات صفر کے برابر ہیں۔ مجھ سے خوش ہو کر اکثر کہا کرتے ــــ "خدا تمہارے اونٹوں اور بھیڑوں کی تعداد میں اضافہ کرے، خدا کرے تمہارا قبیلہ فتحیاب ہو اور دشمن قبیلے غارت ہوں"۔

بدو اور اونٹ کی محبت بڑی پرانی ہے لیکن اونٹ پاگل ہو جائے (سردیوں میں اونٹ تھوڑے بہت پاگل ضرور ہو جاتے ہیں) تو ساربان ارواح خبیثہ کا اثر سمجھ کر بجائے مالش کرنے کے اسے زدوکوب کرتے ہیں (جو بالکل غلط علاج ہے) طویل سفر سے پہلے جیسے موٹر کا تیل پٹرول وغیرہ چیک کیا جاتا ہے اسی طرح اونٹ کو بھی چیک کرتے ہیں۔ اونٹ میں پچیس چھبیس گیلن پانی سما سکتا ہے لیکن وہ اتنا سارا پانی خوش ہو کر کبھی نہیں پیتا۔ خشک صحرا عبور کرنا ہو تو اونٹ کو ڈھا کر بالٹیوں سے منہ میں پانی ڈالا جاتا ہے (اور پھر اس سے شتر غمزوں کی توقع کی جاتی ہے)

رات کا سفر تاروں کی مدد سے ہوتا ہے حدی خوانی بھی کی جاتی ہے دکھا جاتا ہے کہ جب ساربان اونٹ کے کان کے نزدیک بلند آواز میں گاتا ہے تو اونٹ بہت خوش ہوتا ہے)

اونٹ چلتے چلتے دفعتاً چست ہو کر بھاگنے لگے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ نخلستان قریب ہے۔ غالباً اونٹ نخلستانوں کے سلسلے میں خود صحرا عبور کر لیتا ہے، اس مرتبہ رات کے

سفر پر میں نے ساربان سے پوچھا کہ کون سا ستارہ چہا ہے؟ اس نے ایسی نگاہوں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ——

"ستارہ کیسا —— اونٹ جانے اور منزل مجھے کچھ پتہ نہیں ——"

صحرا میں جگہ جگہ کھنڈر ملتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کبھی دریا نے رُخ بدل لیا، گزرتی ہوئی فوج کچھ عرصہ ٹھہر گئی کبھی چشمے سوکھ گئے اور صحرا کا ایک اور شہر اجڑ گیا، پھر آندھیوں نے کھنڈرات کو یوں دفن کیا کہ قریب سے گزرنے والے کو شبہہ تک نہیں ہوتا کہ یہاں کبھی آبادی تھی لیکن اب تو بستے ہوئے گاؤں اور کھنڈرات اس قدر خلط ملط ہو چکے ہیں کہ ایک پر دوسرے کا گمان ہوتا ہے (پچھلی صدی میں ایک کشتی اشوریوں کے زمانے کی برآمد شدہ چیزیں لئے جا رہی تھی کہ دجلے میں ڈوب گئی، قریب کے گاؤں کے باشندوں نے دریا سے سب کچھ نکال لیا، ڈھائی ہزار سال پرانے ہل سہاگے وغیرہ مدتوں استعمال کئے) بارشوں کا موسم آتا ہے، کتنی مرتبہ نیلے نیلے بادل ترسا کر نکل جاتے ہیں آخر بوندیں پڑتی ہیں، دیکھتے دیکھتے خشک وادیوں میں ندیاں بہنے لگتی ہیں، مدتوں کے پیاسے درخت گرد و غبار اتار کر تر و تازہ ہو جاتے ہیں، جھلسی ہوئی زمین سے قسم قسم کی خوشبوئیں آتی ہیں —— پانی طرح طرح کے تماشے کرتا ہے کہیں مچلتے ہوئے بھنور بنائے کہیں تالاب بن کر ساکن ہو گیا، چٹانوں پر پھواریں بکھریں، خاردار جھاڑیوں سے موتی ٹپکائے، یہاں آبشار گرائی وہاں دلدل بنائی۔ اور غائب ہو گیا

بہار آتی ہے تو میلوں تک رنگ و بو کا طوفان بپا ہو جاتا ہے۔ رنگ رنگ کے خودرو پھول کھلتے ہیں کہیں سے بے شمار تتلیاں آجاتی ہیں —— نیلے پھولوں پر گلابی تتلیاں، زرد کلیوں پر نارنجی تتلیاں —— رنگوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ رونق صرف چند ہفتوں کی ہوتی ہے مگر اس مختصر سے وقفے میں جو کچھ نظر آجاتا ہے وہ سال بھر کے لئے کافی ہوتا ہے۔

لیکن بدوؤں کو ساری نباتات میں فقط کھجور سے الفت ہے ـــــــ اس کا ذکر بڑے پیار سے کرتے ہیں ـــــــ

"کھجور کا درخت تب خوش ہوتا ہے جب اس کی چوٹی جہنم میں ہو اور جڑیں بہشت میں ـــــــ" (ماہرین کا کہنا ہے کہ اس علاقے میں جتنے درخت تھے سب برباد ہو گئے، کھجور اس لئے رہ گئے کہ یہ اونٹوں اور بکریوں کے لئے ذرا اونچی تھی ـــــــ)

ایک دن لاری خبر لائی کہ میرا تبادلہ ہو گیا ہے ـــــــ

کیمپ پہنچ کر معلوم ہوا کہ مجھے جن لوگوں کے ہمراہ جانا ہے وہ کسی نامعلوم مقام پر جا رہے ہیں منزل کے متعلق قیاس آرائیاں ہونے لگیں، روانگی کی صحیح تاریخ کی اطلاع بھی بغداد سے آنی تھی، صبح سے شام تک میں ٹیلیفون کا انتظار کیا کرتا۔

موسیٰ نے بتایا کہ اس کے بیٹے نے لکھنا سیکھ لیا ہے اور پہلا خط باپ کو لکھا ہے اس نے لڑکے کی تصویر دکھائی "والد صاحب اسے بہت چاہتے تھے، جب یہ پیدا ہوا تو انھوں نے مجھے بالکل بھلا دیا تھا ہر وقت پوتے کو اٹھائے اٹھائے پھرتے ـــــــ سود اصل سے زیادہ پیارا ہوتا ہے ـــــــ شاید اسی معصوم کے طفیل حالات بہتر ہو جائیں۔"

منصور اور میں لمبی سیروں پر جاتے۔ بار بار خطرے کا مقابلہ کر کے اس میں ایسی خود اعتمادی آچکی تھی کہ موجودہ پر امن زندگی سے مطمئن نہیں تھا ـــــــ "میں بے چین ہوں حالات اور حریفوں سے نبرد آزمائی کئے ہوئے عرصہ ہو چکا ہے۔ ایسے ایک اور تجربے کافی نہیں ہوتے۔ جب موقع ملے الجھ جانا چاہیے۔ ورنہ نہ اپنی خامیوں کا صحیح اندازہ ہوتا ہے نہ خوبیوں کا۔ جہاں تم جا رہے ہو وہاں انتظار اور تشویش سب سے بڑے دشمن ہونگے،

طرح طرح کے وسوسے اُٹھیں گے، جب پرانے بندھن اپنی طرف کھینچیں گے تو دنیا اندھیری معلوم ہوگی لیکن دن گزرتے چلے جائیں گے اور کچھ بھی نہیں ہوگا، اور پھر جب موقع آئے گا تو سب کچھ بھول جاؤ گے، نہ ماضی یاد رہے گا نہ مستقبل، بس ایک دھن سوار ہوگی کہ اگر اس وقت ذرا سی چوک ہوئی تو کہیں خود اپنی نگاہوں میں نہ گر جاؤں ـــــ بعد میں اپنے شبہات پر ہنسو گے، اس طویل وقفے پر قہقہے لگاؤ گے جس میں سوچ سوچ کر برا حال کر لیا تھا ـــــ اگلی آزمائش مقابلتاً آسان ہوگی، پھر کچھ عرصے کے بعد خطرہ خطرہ نہیں رہے گا ـــــ "

اس نے ایک واقعہ سنایا "سات گڈریئے طوفان میں گھر گئے، دوپہر سے شام ہوگئی، لیکن طوفان کی تیزی کم نہ ہوئی، بجلی بار بار کڑکتی لیکن بادلوں ہی میں رہ جاتی۔ آخر ایک معمّر گڈریئے نے کہا کہ آج ہم میں سے کسی کی جان لے کر ٹلے گی، چھپ کر انتظار کرنے سے بہتر ہے کہ باری باری باہر نکل کر وادی عبور کریں، جو نکل گیا بچ جائے گا ـــــ قرعہ اندازی ہوئی پہلا گڈریہ ڈرتا ہوا نکلا کانپتے کانپتے وادی طے کی، دوسری طرف پہنچ کر خوشی کا نعرہ لگایا۔ دوسرا گذر گیا لیکن بجلی نہیں گری، تیسرا، چوتھا، پانچواں ـــــ پھر چھٹا لرزتا ہوا نکلا بجلی پھر بھی نہ گری ـــــ جب دوسری طرف چھ کے چھ ہنس رہے تھے تو ساتواں جھونپڑی میں کھڑا موت کا انتظار کر رہا تھا ـــــ یکلخت بجلی کڑکی زور کا دھماکا ہوا ـــــ دوسرے کنارے پر چھ گڈریئے مرے پڑے تھے ـــــ جو قسمت میں لکھا جا چکا ہے وہ نہ ایک دن پہلے ہوتا ہے نہ ایک روز بعد میں ـــــ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا ـــــ "

بغداد سے اطلاع آگئی اور میں اسی روز چل پڑا۔ اپنے نئے ساتھیوں سے ملا اور چند ہی دنوں میں ہم دجلے کو چھوڑ کر دور نکل گئے۔ اس کے بعد ایک نئی زندگی شروع ہوئی، جو کچھ دیکھا محسوس کیا بالکل عجیب تھا۔ ہر واقعہ نت نئے تاثرات لاتا، ہر تجربہ دوسرے سے مختلف تھا، نظریئے بنتے ختم ہوتے رہے۔ مسرت، بےچینی، اطمینان، فکر ـــــ ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے۔

کچھ عرصے کے بعد جب واپس لوٹا تو بغداد پہنچ کر یوں لگا جیسے چھوٹی سی بستی میں آگیا اور کیمپ تو بالکل سنسان جگہ معلوم ہوئی۔ پرانے رفیق اب تک وہیں تھے محفلیں بھی اسی طرح جمتیں لیکن ان کی نوعیت میں فرق آگیا تھا۔ ان میں شریک ہوتا مگر طالب علم کی حیثیت سے نہیں۔ آدھی گفتگو سنتا آدھی سُنائی نہ دیتی ــــــ اپنی ہی باتیں سوچتا رہتا۔

سنیچر کی شام کو بغداد جاتے تو وڈ سے ملاقات ہوتی، ورنہ ہفتے بھر نظر نہ آتا۔ شام کو کبھی کوئی پوچھ بیٹھتا ــــــ وڈ نہیں آیا؟ تو برٹن کہتا ــــــ "وہ اپنے آپ کو سکاٹسمین بتاتا ہے ــــــ شاید تبھی سنیچر کی شام کیلئے چھ دن کنجوسی کرتا ہے ــــــ"

وڈ پہلے تاریخ کا ماسٹر تھا؛ اس کی گفتگو کا آغاز عموماً اسکاٹ لینڈ سے ہوتا ــــــ "شاید آپ نہیں جانتے کہ سکاٹ لینڈ والوں کی کنجوسی کے قصے خود ان ہی لوگوں نے مشہور کئے ہیں ــــــ وہاں کے کسی باشندے نے لاٹری کے دو ٹکٹ خریدے، اتفاق سے ایک ٹکٹ نکل آیا، لاٹری والوں کا نمائندہ انعام لے کر پہنچا اور پوچھا کہ اگر تمھیں بیس ہزار پونڈ مل جائیں تو کیا کرو گے؟ ــــــ سب سے پہلے انھیں گنوں گا ــــــ جواب ملا۔ بیس ہزار پونڈ لے کر سکاٹسمین نے سر پیٹ لیا ــــــ ہائے افسوس، وہ دوسرا ٹکٹ کیوں خریدا تھا ــــــ"

اس کے بعد سے تاریخ شروع ہوتی ــــــ نپولین کا قول ہے کہ بار بار دشمن سے مت لڑو ورنہ وہ تمہاری ساری چالیں سمجھ جائے گا۔ یا دشمن کے بارے میں برنارڈ شا نے کہا ہے کہ دشمن کی قدر کرو کیونکہ وہ تمہیں چست رکھتا ہے، نچلا نہیں بیٹھنے دیتا ــــــ وغیرہ وغیرہ۔ اتنی دیر میں نشہ چڑھنے لگتا، مخمور ہوتے ہی اس کا لہجہ تلخ ہو جاتا، بڑی طنزیہ باتیں کرتا "مشرق مشرق ہی ہے ــــــ یہاں کے بیشتر باشندے فقط محبت، شاعری، منشیات اور قدیم عظمت کے سہارے زندہ رہتے ہیں ــــــ میں پہلی دفعہ ہندوستان گیا تو سونے چاندی میں لپٹی ہوئی مٹھائیاں اور پان دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ یہ لوگ سارا سونا چاندی تو اس طرح

لکھا جاتے ہیں، غربت کیوں نہ ہو — شنگھائی میں اتنے باشندے چھتوں سے کود کود کر خود کشی کرتے ہیں کہ راہگیروں کو مجبوراً سڑک کے بیچ میں چلنا پڑتا ہے —"

برٹن کو اس کی باتیں ذرا نہ بھاتیں، قہقہہ لگا کر کہتا — "ڈڈ تم سے دور گزارے ہوئے چند روز اتنے خوشگوار ہوتے ہیں جیسے بحیرہ روم کی بندرگاہ پر چھٹی کے چند مہینے —"

"موصل کے شمال مشرق میں یزیدی رہتے ہیں بارھویں صدی میں ان کے شیخ نے تلقین کی کہ کسی سے نفرت نہ کرو۔ چنانچہ یہ کسی سے نفرت نہیں کرتے یہاں تک کہ شیطان سے بھی نہیں ان کا عقیدہ ہے کہ فی الحال شیطان زیر عتاب ہے کسی نہ کسی دن اسے معافی مل جائے گی —"

سب خاموش ہو جاتے — لیکن وہ بولتا چلا جاتا —

"پرسوں بغداد میں روز نے ایک قالین کی قیمت پوچھی، پھیری والے نے پچاس پونڈ مانگے، ایک گھنٹے کی بحث کے بعد پانچ پاونڈ پر فیصلہ ہوا۔ جب ویسے ہی قالین کے لئے میں نے بھی پانچ پونڈ نکالے تو پھیری والے نے کہا کہ یہ سودا تو ان صاحب سے ہوا ہے آپ سے از سر نو بحث شروع کروں گا —"

ہمیں چپ پا کر وہ اور خفا ہوتا — "کچھ تو بولو —"

"ہم آپ سے متفق ہیں —" میں تنگ آ کر کہتا۔

"یوں نہیں باقاعدہ بحث کرو۔"

موہن بہت جھنجھلاتا — "خان صاحب جن لوگوں کو موافق نہیں آتی وہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ لعنت ہے ایسے نشے پر —"

وڈ بغداد جاتا تو کباڑی بازار کی سیر ضرور کرتا، سارے دن کی چھان بین کے بعد کوئی سستی سی بوسیدہ کتاب خریدتا۔ لائبریریوں میں جا کر ایسی کتابیں تلاش کرتا جن سے سنیچر کی شام کے لئے مواد مل سکے۔ واپس آ کر شکایت کرتا — "یہاں کے کباڑی

بازار میں کچھ نہیں ـــــ ان کی باقاعدہ تنظیم ہونی چاہیئے ـــــ کسی ملک کے کلچر کا صحیح اندازہ کباڑیوں کی دکانیں دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے ـــــ کہ لوگ کیسی کتابیں پڑھتے ہیں کیسا سامان خریدتے ہیں، ان کی معاشی حالت کیسی ہوتی ہے ـــــ"

بغداد میں جرجیس پل پر کھڑی ہوئی لڑکیوں پر تبصرہ کر رہا تھا ـــــ "یہ حسین ہے مگر فربہ ہے وہ پڑھی لکھی معلوم ہوتی ہے بہت موٹے فریم کی عینک لگا رکھی ہے ـــــ اور اسے احساس کمتری ہوگا اونچی ایڑی کے جوتے ہیں اور اس قدر میک اپ! مگر جو مٹک مٹک کر چل رہی ہے وہ خوب ہے ـــــ"

"جرجیس یوں دل خوش کرنا بیکار ہے ـــــ سب سے اچھی وہ ہے جو ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ساتھ چلے ـــــ"

اور میرا ماتھا ٹھنکا۔

"ان چند مہینوں میں کچھ ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں تو ـــــ" وہ مسکرانے لگا۔

"ہمارے ہاں مثل مشہور ہے کہ ہمیشہ بھرے میلے سے رخصت ہونا چاہیئے ـــــ"

شام کو رقص گاہ میں سب خاموش سے تھے سوائے جرجیس کے۔ منصور چپ تھا، سعدہ نظریں نیچی کئے بیٹھی تھی، سلیم دو تین مرتبہ اپنے خونخوار سے دوستوں سمیت آیا لیکن میں نے بھگا دیا۔

منصور رقص کرنے گیا تو سعدہ نے مجھ سے پوچھا ـــــ "ان چند مہینوں میں تمہیں کون فلسفی بنا گیا؟ کیا ہوا تھا؟"

"کچھ نہیں ـــــ"

سعدہ کی سہیلیاں آگئیں، لوی زا نے ہتھیلی سامنے کر دی "صحرا نوردی کر کے آئے ہو ـــــ کوئی پیشین گوئی کرو ـــــ"

جرجیس سرپٹ بھاگا آیا ــــــ "اب پتہ چلا کہ تمہاری مقبولیت کا راز کیا ہے، نرم ونازک ہاتھوں کو دیکھ چکے سخت اور کھردری ہتھیلیاں بھی تھامو ــــــ"

جرجیس لکیریں کہتی ہیں کہ تمہاری شادی ہوگی ــــــ"

"کس سے ہوگی؟ اس کا نام کیا ہے؟" اس نے لوی زا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک لڑکی سے ہوگی جس کا نام مسز جرجیس ہوگا ــــــ"

"جان گیا، وہ سب سے انوکھی ہے، حسین ہے، ذہین ہے ــــــ اور میں اس پر بری طرح فریفتہ ہوں ــــــ" وہ لوی زا کو ٹکٹکی لگائے گھور رہا تھا۔

"اس سے شادی کروگے؟"

"موضوع مت بدلو ــــــ بلکہ یہ بتاؤ کہ اسے مجھ سے کتنی محبت ہوگی؟ مانا کہ میں اتنا حسین نہیں ہوں پھر بھی محبت ــــــ"

"تو کیا ہوا دن بھر تو تم دفتر میں رہا کروگے ــــــ"

"مصیبت تو یہ ہے کہ تمہاری معلومات بالکل محدود ہیں، تب ہی لڑکیوں کے معاملے میں اتنے شورلیس ہو، حالات بدل چکے ہیں ــــــ وہ دن گئے جب لڑکے ڈینگیں مارتے تھے کہ آؤ یاروان حسین تصویروں کو دیکھو اور خاکسار کے ذوق کی داد دو ــــــ اب تو لڑکیاں بلا جھجک کہتی ہیں سہیلیو چند بے وقوفوں کی تصویریں دکھاؤں؟"

فوراً تو تو میں میں شروع ہوگئی۔

پروگرام بنا کہ دجلے میں کشتی کی سیر کی جائے۔ بڑی سہانی رات تھی، چاند نکلا ہوا تھا ــــــ

لولیتا ایک نئی لڑکی کو لے کر آئی اور مجھ سے کہا ــــــ "ہم دونوں آپ کی کشتی میں چلیں گی"

منصور نے مجھے بتایا کہ یہ لطیفہ ہے، سعدہ کی چھوٹی بہن، ابھی ابھی ایران سے آئی ہے۔

"یہ التفات اس لئے ہے کہ ساری شام تم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ لڑکیوں کے بھی عجیب موڈ ہوتے ہیں آج خوشامد چاہتی ہیں تو کل بے رخی پر ریجھ جائیں گی ——"

جرجیس کو سواریاں نہیں مل رہی تھیں —— لوی زا سے کہہ رہا تھا ——،

"انکار مت کرو، خدا کے لئے کچھ چاند تاروں ہی کا لحاظ کرو، آرٹسٹ ہوتے ہوئے ایسی حسین رات کو نظر انداز کر دو گی —— کیا تمہیں قدرتی نظاروں کا اتنا سا بھی خیال نہیں؟"

میں نے چپو سنبھالے —— تھوڑی دور گئے ہوں گے کہ لطیفہ بولی ——

"کنارے پر چلئے میں کچھ بھول آئی ہوں۔"

واپس گئے، دونوں میں کھسر پھسر ہوئی اور لویتا اتر گئی۔

"چلئے" —— لطیفہ نے کہا۔

میں نے پھر چپو سنبھالے —— لیکن کشتی کے رخ کے متعلق ہدایتیں ملنے لگیں۔ اس طرف موڑیئے —— اب اس طرف چلئے دراصل وہ چاہتی تھی کہ چاند کی طرف منہ ہو جائے لیکن اس طرح کشتی غلط رخ میں چلی جاتی —— "جگمگاتے چہروں کو چاندنی کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے تنگ آکر کہا۔

آپ کس ٹائپ کے ہیں؟" وہ خوش ہو کر بولی —— "انٹلکچوئل آوٹ ڈور، یا کچھ اور؟"

"کچھ اور —— میں نے جواب دیا

"یہ صحیح ہے کہ لڑکیاں زیادہ تخیل پرست ہوتی ہیں؟"

"صحیح تو ہے مگر درست نہیں ——"

"کیوں ——؟"

اس لئے کہ کچھ لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو جھاڑیوں میں پرندے تلاش کرنے کی بجائے کھیل شروع ہوتے ہی پتے میز پر رکھوا لیتی ہیں ——"

"یہ بتائیے کہ محبت کے لئے حسن و دل کشی کے علاوہ اور کیا کیا خوبیاں ضروری ہوتی ہیں ——؟"

"موقعے پر موجود ہونا نہایت اہم ہے، فرصت نہ ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا ——"

"لیکن آپ کو یہ علم نہیں کہ عورت کا دل اُس کے ہونٹوں سے پہلے ہاں کہتا ہے، یہ وقفہ اُس کے لئے حسین ترین وقفہ ہے جسے وہ زیادہ سے زیادہ طویل کرنا چاہتی ہے —— جہاں مرد ہر معاشقے کو اپنا پہلا رومان کہتے ہیں وہاں عورت معاشقے کو اپنا آخری رومان بنانا چاہتی ہے۔"

"یہ آپنے کس کتاب میں پڑھا تھا؟"

"آپ کو غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے —— ہم دونوں ہم ذوق ہیں اس لئے ایسی باتیں کہہ رہی ہوں ——" اس نے سعدہ کا ذکر چھیڑ دیا —— "حالانکہ وہ میری سگی بہن ہے لیکن ہم بچپن سے دور دور رہے ہیں، تبھی ایک دوسری سے اجنبی کی طرح ملتی ہیں —— اس کے باوجود میری بہن ہے بھلا میں یہ کیسے بتاؤں کہ آپ میں کوئی دلچسپی نہیں —— منع کرنے پر بھی وہ سلیم سے ملتی ہے —— یہ اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو ——؟"

"کنارے کی طرف ——"

"سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں ——" وہ چڑ گئی۔

"سب عورتیں ایک سی ہوتی ہیں ——"

واپسی پر منصور بولا —— "جب دو بہنوں یا دو عزیز سہیلیوں سے واسطہ پڑ جائے تو ٹل جانا چاہئے —— ورنہ بڑی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سعدہ کی نظریں تمھاری کشتی پر تھیں ——"

"میں بھی اس مقولے کو جانتا ہوں —— ابھی ابھی اسی پر عمل کیا تھا۔"

موہن پھر غمگین رہنے لگا۔ شاید حالات پھر خراب ہو گئے تھے، اکثر پوچھتا ——— "یہ بتائیے کہ محبوبہ، دوست، بیوی، اولاد ——— ان سب سے اچھی طرح پیش آتے رہو ہاں میں ہاں ملاؤ تو سب خوش رہتے ہیں لیکن ایک غلط فقرہ منہ سے نکل جائے تو فوراً خفا ہو جاتے ہیں ——— بعض دفعہ تو بغیر کسی وجہ کے پرانی رفاقت ختم ہو جاتی ہے ——— یہاں ہمیشہ ڈر ڈر کر کیوں رہنا پڑتا ہے؟"

میں خاموش ہو جاتا ———

"میں نے فلسفے کا سہارا لیا، اپنے آپ کو سمجھایا کہ میری روح ان سب بکھیڑوں سے آزاد ہے، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مجھ پر وقتی طور پر بیشک اثر ڈال لیں لیکن روح تک نہ پہنچیں ——— مگر کامیابی نہیں ہوتی۔"

"منصور نے مثال دی تھی کہ محبوبہ کی محبت چاند کی طرح ہے جو گھٹتا بڑھتا ہے لیکن بھائیوں اور دوستوں کی محبت تاروں جیسی ہے، جگمگاہٹ کم ہے لیکن ہمیشہ رہتی ہے ——— منصور کو تو دوستوں پر بڑا ناز ہے کسی نے دوستوں کا طعنہ دیا کہ جھوٹے اور بے وفا ہیں تو منصور نے جواب دیا کہ وہ دوست نہیں دور کے رشتہ دار ہوں گے؛ کیونکہ رشتہ دار تو حصے میں آجاتے ہیں دوست انسان خود چنتا ہے ———"

"یہ تو منصور کا نظریہ ہے، آپ بھی کچھ بتایا کریں ——— ان چند مہینوں میں آپ نے کئی جگہیں دیکھی ہیں آپ اب اتنے ناتجربہ کار نہیں رہے ———"

"اچھا میں کسی دن ضرور آؤں گا ———" میں وعدہ کرتا۔

جرجیس کو سمجھایا جاتا تو وہ کڑھنے لگتا ——— "مجھے سب بے وقوف سمجھتے ہیں، ساری عمر نصیحتیں ہی سنتا رہوں گا، دیکھ لینا کسی روز میرا نصیبہ ضرور جاگے گا، جس کام میں ہاتھ ڈالوں گا کامیابی ہوگی، وہ دن دور نہیں ہے ———"

لیکن روز اسے حساب لگا کر بتاتا ——— "لڑکی کچھ کہ سوچ کر بتاؤں گی یا

والدین سے مشورہ لینا ضروری ہے تو تین مہینے سے زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہیئے ـــــــ مگر اس عرصے کے بعد وہ خاموش رہے تو سمجھ لو کہ اسے تمہاری پرواہ نہیں ہے ـــــــ کیونکہ سوچنے لینے کے لئے تین مہینے کافی ہوتے ہیں ـــــــ"

ایک شام کو کچھ مہمان آئے ہوئے تھے اچھی اچھی باتیں ہو رہی تھیں کہ وڈ آگیا۔ سب خاموش ہو گئے۔ اس نے پہلے تو سکاٹ لینڈ کی باتیں کیں جب نشہ چڑھا تو فوراً مشرق کا ذکر چھیڑ دیا ـــ" خلافت کے آخری دنوں میں ایک حکمراں نے قسم کھائی کہ جب تک منگولیا کی خاک نہ روند لوں چین سے نہ بیٹھوں گا۔ جب کچھ بھی نہ ہوا تو وزیروں نے منگولیا سے مٹی کی چند بوریاں منگائیں مٹی دربار میں بچھائی گئی جسے روند کر حکمراں مطمئن ہو گیا ـــ ایسی ہی باتوں سے چڑ کر ہلاکو نے حملہ کیا تھا ـــــــ"

"اس مرتبہ بغداد سے کون سی پرانی کتاب لائے ہو؟" برٹن نے ہنس کر پوچھا۔

"بغداد کے بستے ہی دو نئی شخصیتیں آئیں ـــــ وزیر، جو خلیفہ اور رعایا کے بیچ میں آ کر کھڑا ہوا اور جلاد جو دربار میں تلوار لئے منتظر رہتا ـــــــ"

"تیسرا اوڈ تھا جو کباڑیوں کا مہتمم مقرر ہوا۔" روز نے لقمہ دیا۔

"حالانکہ عربوں کی سلطنت بحر اوقیانوس سے بحر ہند تک پھیل چکی تھی لیکن یورپ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتے تھے، دسویں صدی میں جغرافیہ داں مسعودی نے لکھا ہے ـــ شمال کے لوگ ایسے علاقوں میں رہتے ہیں جہاں سورج نصف النہار پر کبھی نہیں آتا۔ شاید سردی، نمی اور برفباری نے انھیں گرمجوشی اور تپاک سے محروم کر دیا ہے قوی الجثہ باشندے نہ لطیف جذبات سے آشنا ہیں نہ آداب گفتگو سے ـــــــ"

"معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی نے وڈ کے بارے میں لکھا ہے ـــــــ" برٹن بولا

"پھر گیارھویں صدی میں طلیطلہ کے قاضی نے کہا کہ یورپ کے باشندوں کے رنگ پیلے ہیں اور جسم بے ڈھنگے، وہ حجامت نہیں کراتے، ان میں ذہانت، سرگرمی،

مفاہمت اور وسیع النظری کی کمی ہے اور وہ جہالت، تعصب اور بدتمیزی کی طرف مائل ہیں
—— طلیطلہ کے قاضی کو یہ خیال نہ آیا کہ طلیطلہ یورپ میں ہے ——"

قاضی نے یہ بیان وڈ جیسے آدمیوں کو مدنظر رکھ کر دیا ہوگا ——" روز بولا۔

"عربوں کو مغرب میں ذرا دلچسپی نہیں تھی یہاں تک کہ ابن خلدون جیسے عالم نے چودھویں صدی میں تحریر کیا کہ سنا ہے کہ بحیرۂ روم کے شمالی ملک کافی ترقی یافتہ ہیں، وہاں سائینس اور فلسفہ عروج پر ہیں اور طلباء کی تعداد کثیر ہے لیکن حقیقت کیا ہے یہ کوئی نہیں جانتا ——"

"ابن خلدون کو شبہہ اس لئے ہوا ہوگا کہ اس نے وڈ کو دیکھ لیا ہوگا ——" ایک طرف سے آواز آئی لیکن وڈ لگاتار بول رہا تھا —— برٹن نے پہلے کسی مخمور کو نہیں ڈانٹا تھا لیکن اس روز غصہ ضبط نہ کرسکا —— بڑے تلخ لہجے میں بولا —— "وڈ! اول تو تم سکاٹسمین نہیں ہو کیونکہ تمہاری ساری عمر جنوبی افریقہ میں گزری ہے پھر تمہیں یہ پتہ نہیں کہ لوگ ملک کا اندازہ فقط ان چند باشندوں سے لگاتے ہیں جن سے اتفاقاً ملاقات ہوجائے میں جانتا ہوں کہ انسان متضاد عناصر سے بنا ہے بے وقوفی، دانائی، بزدلی، دلیری شرافت اور خباثت کا مرکب ہے —— اصل چیز ہے امتزاج کہ ان عناصر کا توازن کیا ہے اور اس کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ وہ چاہے تو خوبیوں کی تکمیل کرسکتا ہے برائیوں کو دبا سکتا ہے خدا کے لئے تم بھی کبھی کوشش کیا کرو ——" اگلی صبح برٹن نے ٹیلیفون کیا اور وڈ کا تبادلہ ہوگیا۔

کچھ عرصہ صحرا میں گزار کر میں واپس کیمپ پہنچا تو معلوم ہوا کہ جرجیس لاپتہ ہے۔ اس کے محکمے والوں نے اسے موصل کی طرف بھیجا تھا تب سے نہ کوئی خبر آئی نہ خط۔ مجھے یونہی وہم سا رہنے لگا نہ جانے بیچارہ کس حال میں ہوگا اس کا بھیگی ہوئی تصویریں اٹھانا یاد آتا۔ سب کہتے کہ فکر مت کرو خدا شکر خورے کو شکر ہی دیتا ہے کہیں مزے کر رہا ہوگا۔ لیکن میری

تشویش نہ گئی آخر ایک روز اس کے گاؤں کا پتہ پوچھ کر پہاڑوں کی طرف نکل گیا ــــــ بڑی مصیبتوں سے وہاں پہنچا، گھر تلاش کر کے آواز دی، سفید بالوں والی معصوم سی ضعیفہ باہر نکلی بالکل روئی کی گڑیا معلوم ہوتی تھی ــــــ "آپ جرجیس کے دوست ہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ کتنے دنوں سے آپ کا انتظار کر رہا ہے، ہر آہٹ پر چونک کر پوچھتا ہے امی میرے دوست تو نہیں آئے؟ بتاتی ہوں کہ نہیں آئے تو خفا ہوتا ہے، امی وہ ضرور آئیں گے میرے دوست ایسے نہیں ہیں کہ میں یاد کروں اور وہ نہ آئیں ــــــ ضعیفہ رونے لگی۔ اس کی پر شفقت غمگین آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو گرنے لگے۔ اندر جرجیس لیٹا ہوا تھا، اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ پہچانا نہ جاتا تھا ــــــ

"دیکھا امی! میں یہ نہ کہتا تھا کہ یہ آہٹ میرے دوست کی ہے"

میں نے بازوں کا سہارا دے کر اسے اٹھایا ــــــ "کیا ہوا جرجیس، میرے عزیز دوست یہ کیا حالت بن گئی؟"

یقین نہ آتا تھا کہ یہ ہڈیوں کا پنجر وہی کھلنڈرا زندہ دل لڑکا جسے ہمیشہ بہتر دنوں کی توقع رہتی تھی۔ اب اچھی طرح بات بھی نہیں کر سکتا۔ گاؤں میں کوئی طبیب نہیں تھا، بوڑھی بیچاری کو جو کوئی الٹا سیدھا مشورہ دیتا اسی پر عمل کرتی، اوٹ پٹانگ دوائیاں ٹونے ٹوٹکے سب آزما چکی تھی۔

ضعیفہ رات بھر باتیں کرتی رہی ــــــ "عمر بھر کی پونجی چار بچے تھے ان میں سے تین بچپن میں سدھار گئے اور خدا گواہ ہے کہ میری سستی یا لاپرواہی سے نہیں مرے، جب رخصت ہوئے تو بالکل موٹے تازے تھے پھر ان کے والد کا بلاوا آیا موت سے پہلے انھوں نے میری خدمت اور توجہ کی تعریف کی۔ جرجیس کو جن مصیبتوں سے پالا میں ہی جانتی ہوں، اس کی تنخواہ میں سے کچھ بھی نہیں لیا، بلکہ جو بچتا اسے بھیج دیتی کہ کہیں پردیس میں تکلیف نہ ہو، لیکن اس بیماری سے یہ کیسا بدل گیا ہے، جو کچھ اسے سکھایا تھا بالکل بھلا

بیٹھا ہے پہلے سچا اور نیک تھا اب جھوٹ بولنے لگا ہے، بے ادبی، چغلیاں، خدا سے نہ ڈرنا چڑچڑا پن ـــــ نئی نئی باتیں سیکھ گیا ہے ـــــ" اس کے پژمردہ چہرے کی جھریاں اور گہری ہوگئیں، ان محبت بھری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔ مصیبتیں، صدمے، امیدیں، خوش فہمی، صبر و تحمل ـــــ ایک ماں کی ساری زندگی سامنے آگئی۔

"تم تو اسے جانتے ہو ـــــ بتاؤ یہ کیوں اتنا بدل گیا ہے؟"

"بیماری بڑی ظالم چیز ہے۔ جہاں جسم کو پھونکتی ہے وہاں خیالات اور عادتوں کو بھی بدل ڈالتی ہے ـــــ میں اسے ساتھ لے جاؤں گا اور بہت جلد تمہارا پرانا جرجلیس واپس گھر آجائے گا" میں نے وعدہ کیا۔

اگلے مہینے جب جرجلیس اور میں گاؤں پہنچے تو ضعیفہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی ـــــ میرے سر پہ ہاتھ پھیر کر دعائیں دیں ـــــ "جرجلیس کے سب سے پہلے لڑکے کا نام تمہارے نام پر رکھوں گی ـــــ"

دجلے کے کنارے تہوار منایا جارہا تھا۔ کیمپ میں بڑی رونق تھی، چراغاں ہوا، باجے بجے بڑی شاندار محفل منعقد ہوئی لیکن وڈ بھی موجود تھا۔ وہ بغداد سے تہوار منانے آیا تھا سب شور مچا رہے تھے، جب گانے شروع ہوئے تو روز نے یہ نغمہ سنایا

"خواب میں دیکھا کہ خوش نما جزیرے میں ہوں
جہاں پھول ہیں موسیقی ہے اور بے فکری ـــــ
جہاں فقط لڑکیاں ہی لڑکیاں آباد ہیں
دو تین سو چنچل حسین خوش گلو لڑکیاں!
اس کے باوجود مجھے بار بار رونا آتا
کیونکہ خواب میں میں بھی ایک لڑکی تھا!

سب نے اصرار کیا کہ برٹن بھی کچھ سنائے، بوڑھا ترنگ میں تھا —— اس نے یہ رباعی سنائی۔

خالی پیٹ بچے کو مت پیٹو
پہلے کچھ کھا پی لو!
زیادہ گرم پانی سے بچے کو مت نہلاؤ
کہیں تمہاری انگلیاں نہ جل جائیں۔

اس پر پٹاخے چلائے گئے، غبارے چھوڑے گئے۔ پھر شکار کے قصے شروع ہوئے، موضوع بدلا اور آباؤ اجداد کے تذکرے ہونے لگے۔ نشے میں ہر شخص اپنا شجرہ کسی مشہور ہستی سے ملا رہا تھا —— آخر روز بولا ——

"حضرات آپ نے DEADSEA کا نام تو سنا ہوگا ——"

سنا ہے! دیکھا ہے!! جانتے ہیں!!! آوازیں آئیں

"ہم سے میرے مورث اعلیٰ نے ہلاک کیا تھا ——"

"وڈ سے بھی کچھ سنو —— کسی نے فرمائش کی۔

"وڈ کی جگہ آج میرا لیکچر ہوگا ——" روز گلاس تھامے اٹھا "میں نے بھی کباڑیوں سے کچھ کتابیں خریدی ہیں لہذا مجھے بھی حق حاصل ہے! —— میرا نام روز اس لئے ہے کہ میرے والد کا نام روز تھا، میرا مذہب بھی وہی ہے۔ اتفاق سے میں مغرب میں پیدا ہوا، پیدائش سے پہلے مجھ سے کسی نے نہیں پوچھا کہ کس براعظم جانا پسند کروگے؟ بچپن سے سننے میں آیا کہ مشرق کے رہنے والے کمزور اور سست ہوتے ہیں، وہمی اور ماضی پرست بھی ہیں، یہ بھی پڑھا کہ مشرق میں قالین اڑتے ہیں، رسے سیدھے کھڑے ہوجاتے ہیں بوتلوں میں سے جن نکلتے ہیں، ہر دوسرا شخص سادھو ہے، ہر تیسرا اعلیٰ بابا، ہر پانچواں مہاراجہ یا نواب ہے۔ چپے چپے پر سانپ سپولیے

اور شہیر منتظر رہتے ہیں، ہر چوراہے کے قریب خزانہ دفن ہے، دعا بے کار ہے مگر بد دعا فوراً لگ جاتی ہے —— یہ تاثرات اُن لوگوں کے تھے جنھیں ایسی باتیں لکھنے کا خاص شوق تھا۔ ان دنوں بھی میں نے مغربی حضرات کو خاص نظاروں کی تصویریں اُتارتے دیکھا ہے "فوٹو گرافی میں بھی تضحیک کا پہلو ہوتا ہے"، سہ پہر کو اونگھتے ہوئے باشندے کوڑے کے ڈھیر، تھکے ہوئے کمزور جانور، فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا حجام، لولے، لنگڑے، اپاہج —— غرضکہ ہم فقط وہی تصویریں کھینچتے ہیں جو کھینچنا چاہتے ہیں، اُنکی روٹی کو پلیٹ اور شلوار کو چھوٹا خیمہ کہکر ہمیں بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

"کسی نے نہیں سوچا —— کہ اگر ہمارے سرسبز و شاداب ملکوں میں دن بھر تپش ہو، لو کے تھپیڑے ہوں، بار بار پانی پینا پڑے، تیز شعاعوں اور ریت سے آنکھوں کی چمک جاتی رہے مکھیاں، مچھر، جراثیم جان کے لاگو ہو جائیں، ہماری خنک اور روح پرور آب و ہوا بدل جائے تو کیا ہم کمزور اور سست نہیں ہو جائیں گے؟ چوری کی واردات کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اخبار فروشوں کا حوالہ دیتے ہیں جو اخباروں کا بنڈل اور ہیٹ سڑک پر چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن اگر سب کی جیبیں بھری ہوئی ہوں تو تانبے کے سکوں کے لئے کوئی بے ایمانی کرے گا؟ کیا وہاں بینک نہیں لوٹے جاتے؟ یہاں کے ظلم و تشدد پسندی کے قصے سناتے وقت وڈ جیسا مورخ بھی بھول جاتا ہے کہ انیسویں صدی کے شروع میں انگلستان میں سوا دو سو جرائم ایسے تھے جن کی سزا موت تھی، شلجم چرانا، خانہ بدوشوں سے دوستی، درخت کاٹنا، بلا اجازت شکار کھیلنا اور جیب کاٹنا ان شدید جرائم کی فہرست میں شامل تھے۔ اٹھارہویں صدی کے شروع میں نہ پولیس تھی نہ جیلخانے تھے، صلیبی جنگوں کو مدتیں گذر چکی ہیں لیکن وہ شکست ہمیں اب تک یاد ہے، پہلی جنگ عظیم میں یروشلم فتح ہوا تو وزیر اعظم نے کہا کہ جو ہمارے سورما صلیبی جنگوں میں نہ کر سکے وہ ہم نے کر دکھایا! —— یہ واقعہ بیسویں صدی کا ہے —— حضرات! میں فقط یہ

کہنا چاہتا ہوں کہ ہمیں مشرق سے بے انصافی نہیں برتنی چاہئے —— اب میں اپنے مورخ دوست وڈسے درخواست کروں گا کہ آئیں اور پرانے واقعات پر روشنی ڈالیں ——"

گروڈ خاموش رہا۔

مومن نے میرے کان میں کہا —— "خان صاحب میں نہ کہتا تھا کہ وہسکی جہاں الٹی سیدھی باتیں کراتی ہے وہاں کبھی کبھی سچ بھی بلوادیتی ہے ——"

برٹن دورے سے واپس آیا تو اُسے تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ پہلے پاؤں میں کانٹا چبھا، پھر پاؤں سوجتا چلا گیا، ہسپتال کا نام لیتے ہی خفا ہونے لگتا —— بڑی مشکلوں سے اُسے لے گئے۔ بار بار یہی کہتا —— "خدا کے لئے زیادتی مت کرو، میں پرانا سپاہی ہوں۔ آج تک ہسپتال نہیں گیا ——"

چند دنوں میں میرے تبادلے کے احکامات آگئے۔ کیمپ کے ساتھیوں سے رخصت ہو کر ہسپتال گیا —— برٹن کا بخار پہلے سے زیادہ تھا لیکن مونچھیں اور بھویں اسی طرح تنی ہوئی تھیں —— مجھے دیکھ کر تکئے کے نیچے سے سگار نکالا —— "اسے سلگالو، پینے کی اجازت نہیں ہے کم از کم اس کی خوشبو ہی سونگھ لوں ——"

پھر باتیں شروع کر دیں، اتنی تکلیف اور نقاہت کے باوجود آواز میں وہی کرارا پن تھا۔

"مجھے چینیوں کا فلسفہ بہت پسند ہے جب تک تندرست رہیں ڈاکٹروں کو فیس دیتے رہتے ہیں، جونہی بیمار ہوئے فیس بند ——" میں نے اپنے تبادلے کا ذکر کیا —— "اچھا، جاؤ دنیا دیکھو، جب میں گھر سے باہر نکلا تو تبادلوں پر پریشان ہو جایا کرتا تھا لیکن بعد میں بڑی خوشی ہوتی، جن ساتھیوں کو گاؤں میں

چھوڑ آیا تھا ان میں سے بیشتر وہیں کہیں چکر لگاتے رہے' دیہاتیوں کی یہ کوشش رہی کہ کسی طرح ترقی کر کے شہر پہنچ جائیں' لیکن شہروں میں دولت کما کر جی چاہتا ہے کہ دیہات میں کوئی باغ ہو یا فارم ——"

درد سے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں' چہرے پر کرب کے آثار تھے لیکن لبوں پر مسکراہٹ بدستور رہی —— "ڈاکٹر نا امید ہو چکے ہیں —— لیکن میں موت اور اگلی زندگی کے متعلق زیادہ نہیں سوچتا —— مجھ سے پہلے ایسے ایسے دلیر اور اعلیٰ انسان اسی راستے سے چپ چاپ گزر گئے جو کچھ اُن پر بیتی ہوگی بیشک مجھ پر بھی بیت لے ——"

اتنے میں ایک چھریری سی حسینہ آئی' برٹن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا نبض دیکھی دو چار مذاق کئے اور چلی گئی —— "یہاں لڑکیاں بہت تنگ کرتی ہیں خصوصاً یہ گریس تو دس دس منٹ کے بعد آتی ہے۔ تم ہی بتاؤ اس عمر میں چہلیں کرتا ہوا اچھا لگوں گا؟ جس دور سے یہ گزر رہی ہے میں تیس پینتیس سال پہلے گزر چکا ہوں —— یہ بتاؤ کہ تمھاری روانگی کب ہے؟"

"آج جانا ہے —— لیکن آپ بیمار ہیں ——"

"نہیں —— آج ہی روانہ ہو جاؤ اور جلدی سے نئی جگہ پہنچ کر ان کی دیکھ بھال کرو جو نوعمر ہیں اور جن سے امیدیں وابستہ ہیں۔ مرے ہوؤں اور قریب المرگ لوگوں کے مقابلے میں انکی تعداد کہیں زیادہ ہے ——"

چلتے وقت کہنے لگا —— "ہمیشہ پھرتیلے رہنا' ایک ترکیب بتاؤں' جو کپڑے پہن رکھے ہیں انھیں محفوظ کر لو' ہر سال پہلی جنوری کو پہن کر دیکھنا جب تک فٹ آتے رہے فٹ رہو گے ——"

منصور سٹیشن پر چھوڑنے آیا' لیکن کچھ افسردہ سا تھا' پچھلے تبادلے پر اُس نے کچھ اور طرح کی باتیں کی تھیں۔ میں نے وعدہ کیا کہ اگر کبھی اس طرف سے گزرا تو ضرور آکر

ملوں گا ـــــ"

"اب تم دور چلے جاؤ گے، بس بے جان خطوط رہ جائیں گے خود نظر نہیں آؤ گے۔ پھر نئی نئی جگہوں میں نئے نئے دوست بنیں گے اور دجلے کے کنارے گزارے ہوئے دن تمھیں یاد بھی نہ رہیں گے"۔

سعدہ آتی ہوئی دکھائی دی ـــــ منصور نے کہا ـــــ "کچھ دیر کے لئے اپنا دل پتھر کا بنا لو ورنہ اچھی بھلی یاد تلخ ہو جائے گی ـــــ ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوگا، کون کہاں جائے گا۔ ٹرین کے چلنے میں بیس منٹ ہیں، کسی طرح دل کڑا کے گزار دو ـــــ"

سعدہ نے سلام کیا، ایک ڈبہ دیا جسمیں کھجوریں تھیں ـــــ

"پھر کب آؤ گے؟"

"پتہ نہیں، شاید اب موقع نہ ملے ـــــ"

"کیوں؟"

"اسلئے کہ وطن دور ہے ـــــ"

"تم وطن تو نہیں جا رہے واپسی پر آؤ گے نا؟"

میں نے منصور کی طرف دیکھا اس نے اشارہ کیا ـــــ

"ان دنوں کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہوگا، کون کہاں جائے گا ـــــ" میں نے اس کا فقرہ دہرایا۔

"لیکن تم تو بتایا کرتے تھے کہ جدائی کا اثر مختلف طبیعتوں پر جدا جدا ہوتا ہے۔ وہی ہوا جو ذرا ذرا سے چراغوں اور شمعوں کو بجھاتی ہے تیز آگ کو اور بھی بھڑکاتی ہے ـــــ"

"ہاں، کسی مفکر کا فقرہ ہے ـــــ"

"جھوٹا وعدہ بھی نہیں کرو گے؛ یاد ہے وہ گیت؟"

گاڑی چل دی۔

راستے میں میں نے تہیہ کر لیا کہ آیندہ اتنی دیر کہیں نہیں رہوں گا کہ چلتے وقت افسوس ہو، اگر کہیں قیام طویل ہو گیا تو کسی سے نہیں ملوں گا۔

کئی برس کے بعد اتفاق پھر مجھے دجلے کے کنارے لے آیا لیکن اس دفعہ مسافر کی حیثیت سے آیا تھا اور فقط چند دنوں کے بعد روانگی تھی۔ سیدھا کیمپ پہنچا فقط چند آدمی لے باقی کے سب جا چکے تھے، سڑک پر گرد اڑاتی تو لاریوں کی جگہ خوبصورت کاریں نظر آئیں۔ بغداد کے دجلے میں روشنیاں اسی طرح جھلملاتیں، کناروں سے موسیقی کی تانیں بلند ہوتیں لیکن وہ غیر معمولی چہل پہل رخصت ہو چکی تھی شور و غل تھا لیکن قہقہے فقط کہیں کہیں سنائی دیتے۔

مجھے اپنا وعدہ یاد تھا چنانچہ کیمپ سے شمال کا رُخ کیا اور منصور کے گاؤں پہنچا ——

"دوست مجھے افسوس ہے کہ زیادہ چھٹی نہیں مل سکی، کل واپس جانا ہوگا ——"

"ملاقات ایک لمحہ کی بھی اچھی ہوتی ہے ——" وہ بہت مسرور تھا بار بار شکریہ ادا کرتا۔ لیکن بجھا بجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔ کنپٹیوں کے بال سفید ہو چکے تھے، چہرے پر تفکرات نے لکیریں کھینچ دی تھیں پہلے تو مہمان نوازی میں اِدھر اُدھر بھاگتا رہا پھر اسکے ساتھ دو پیارے پیارے بچے آئے ——

"میرے لڑکے ہیں ——"

"اور سعدہ —— ؟"

"پتہ نہیں کہاں ہے، شاید بغداد میں ہو —— کیوں ؟" اسے بڑا تعجب ہوا۔

"یونہی پوچھا تھا ـــــ"

سہ پہر کو ہم بھی سیر پر نکلے تو اس نے بتایا کہ اُس کے والد اور بیوی کا انتقال ہو گیا ہے۔

"جس روز والد صاحب سدھارے اسی دن منصور کا لڑکپن بھی ساتھ ہی رخصت ہو گیا۔ شاید اس لئے کہ سر سے سایہ اٹھ جانے کے بعد یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب اپنی باری ہے۔ وہ میرے نہایت گہرے دوست بھی تھے' اس لئے تنہائی سے ڈر کر رفاقت چاہی اور شادی کی ــــ پھر دو بچے چھوڑ کر وہ بھی چلی گئی ــــ"

میرے اظہارِ افسوس پر مسکرا کر بولا ــــ "اور تو اور وہ سب جولانیاں بھی چلی گئیں ــــ" کئی بار جی چاہا کہ مرحومہ کے بارے متعلق پوچھوں۔ کون تھی؟ کیا ہوا تھا؟ لیکن الفاظ ہونٹوں پر آکر رک جاتے۔

"کبھی کبھی مجھے اپنی زیادتیاں یاد آتی ہیں جو اُن لوگوں سے کیں جو مجھ سے محبت اور شفقت کی توقع رکھتے تھے' لیکن تب محسوس بھی نہ ہوتا تھا کہ یہ زیادتیاں ہیں۔"

"یاد ہے بڈھا برٹن نوعمروں کی ناتجربہ کاری کے قصے سنایا کرتا تھا ــــ"

"میرے خیال میں یہ تجربے کی کمی نہیں احساسات کی کمی تھی ــــ حال ہی میں میں نے ایک بڑھیا کو دیکھا جو سردی میں تھر تھر کانپ رہی تھی اُسے گرم کپڑا دیا تو گڑگڑا کر بولی ــــ نہیں ٹاٹ دے دو ــــ میرے اصرار پر اُس نے کہا کہ کپڑے تو خوش نصیب پہنتے ہیں میرے لئے ٹاٹ ہی بہت ہے ــــ میں تھرتھرا اُٹھا پہلے بھی فقیروں کو دیکھا تھا بلکہ انھیں دیکھے بغیر قریب سے گزرا تھا لیکن اب کسی ضعیف محتاج کو دیکھتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ــــ شکار کا بھی اتنا شوق نہیں رہا' کبھی کبھی بے شمار آنکھیں سامنے آجاتی ہیں ــــ ہرنوں کی نمناک پتھرائی ہوئی آنکھیں' پرندوں کی متحیر آنکھیں' دہشت زدہ آنکھیں جن سے آنسو نکل رہے تھے' کچھ ایسی جیسے معصوم بچوں

کی آنکھیں ہوں اور پوچھ رہی ہوں کہ تم نے کیا کیا؟ قطار در قطار یہ آنکھیں سامنے سے گزر جاتی ہیں ——"

ہم پتھر پر بیٹھ کر غروبِ آفتاب دیکھنے لگے ——"

شاید اُس نے میرا تجسس بھانپ لیا تھا ——"تم بالکل اسی طرح ہو آج تک تم نے ایسی بات نہیں پوچھی جسے بتانے میں مجھے عذر ہو۔ لوگوں نے کہا کہ بچوں کی خاطر دوسری شادی کر لو لیکن میں اُس وفادار اور مخلص رفیق کو کیسے بھلا دوں جس نے ہمیشہ میرے جھوٹ کو سچ جانا، میری ضد، لاپرواہی اور تلخ رویّے کو ادائے دلبرانہ سمجھا، جسکی نگاہوں میں مجھ سا کوئی اور زمانے بھر میں نہیں تھا۔ اُس کی علالت طویل ہوتی گئی، میں کچھ دیر پاس بیٹھتا تو کہتی کہ جاؤ کسی سے مل آؤ، کہیں سیر کر آؤ۔ مرنے سے دو روز پہلے اُس نے میرے کپڑے قرینے سے رکھوائے، ملازم کو تاکید کی کہ بغیر ناشتے کے مجھے کبھی باہر نہ جانے دے —— مجھے کبھی یقین سا ہو جاتا ہے کہ وہ ان دونوں بچوں میں زندہ ہے ——"

میں نے بیماری کے متعلق پوچھا۔ "اس علاقے میں بیماری اور صحت کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ ہر مرض کا علاج خوش فہمی اور ٹوٹکوں سے کرتے ہیں، سب کو خواہ مخواہ یقین ہو جاتا ہے کہ بہت جلد شفا ہوگی۔ تبھی ان دنوں میں اپنے بچوں کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ انھیں پڑھانا بھی ہے۔ کہیں اپنی مرضی کے خلاف میدانوں میں جانا پڑے ——

گُردوں کا اعتقاد ہے کہ جیسے دنیا تین قسم کی مٹی سے بنی ہے اسی طرح یہاں تین قسم کے انسان رہتے ہیں۔ پتھریلی زمین پر رہنے والے سخت جان ہوتے ہیں، طوفان آئے، بارش ہو یہ مٹی کہیں نہیں جاتی اور اس کے جفاکش بھی کہیں جا کر خوش نہیں ہوتے۔ میدانوں میں گارا ہے باشندے اسی دلدل میں دھنسے رہتے ہیں بلکہ دوسرے کو بھی پھنساتے ہیں اور پھر چکنی مٹی کو جس سانچے میں چاہو ڈھال لو۔ رہ گیا ریت سو وہ فقط ایک ہی شکل

اختیار کر سکتا ہے' یہاں ٹیلہ ہے' آندھی آ گئی ذرا دور ٹیلہ بن گیا' ٹیلے کو کھودتے جاؤ ریت ہی ریت نکلے گا' ان کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہوتا ہے ـــــ تم بھی تو ملک ملک پھر آئے ہو کچھ کہو ـــــ"

میں خاموش رہا ـــــ

"موہن کو بھی یہی شکایت تھی کہ تم اپنی رائے چھپا جاتے ہو ـــــ"

میں سوچ رہا تھا کہ منصور کچھ اتنا زیادہ نہیں بدلا' میں نے دنیا ضرور دیکھی تھی لیکن زندگی کی بھٹی اُسے کندن بنا رہی تھی' میرا ہمسفر مجھ سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

"کبھی ضرور بتاؤں گا ـــــ وعدہ رہا ـــــ"

"یہی وعدہ موہن سے بھی کیا تھا ـــــ"

"مجھے یاد ہے۔"

آفتاب غروب ہو گیا' آسمان شفق سے جگمگانے لگا ـــــ

"زندگی کے رنج والم کے متعلق کسی نے کہا تھا کہ اگر دن کے اختتام پر اداس اداس پیلے بھورے تاریک بادل نہ ہوں تو غروبِ آفتاب رنگین کیونکر ہو گا ـــــ"

صبح رخصت ہوتے وقت اس نے میدانوں کیطرف اشارہ کیا'

"شاید میں اُن پرشور آبادیوں جا بسوں' اور کچھ عرصے کے بعد ان لوگوں جیسا ہو جاؤں ـــــ تب ملے تو شاید تم منصور کو پہچان بھی نہ سکو گے!"

میں روانہ ہوا تو آسمان مٹیالا سا تھا جیسے آئینے پر کئی روز کی گرد جمع ہو ـــــ ابھی تیز ہوا آئی تو سب کچھ صاف ہو جائیگا۔ لیکن دھندلاہٹ بڑھتی گئی' پہاڑیاں ختم ہوئیں تو دھند چھا گئی اور سہ پہر شام میں تبدیل ہو گئی ـــــ

"آندھی آئے گی!" ڈرائیور بولا۔

دیکھتے دیکھتے سب کچھ سیاہ ہو گیا' موٹر کی روشنی فقط پانچ چھ فٹ تک محدود ہو کر رہ

گئی ہم سڑک پر تھے اس لئے آہستہ آہستہ چلتے رہے، تھوڑی دور جا کر معلوم ہوا کہ راستہ بھول گئے ہیں سڑک پہلے ہی سے اٹ چکی تھی، ہم صحرا میں اندھا دھند چکر لگا رہے تھے ——— پھر ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، شاید ہمارا رخ پہاڑیوں کی طرف تھا سوچا کہ کہیں ٹھہر جانا چاہیئے ——— دور ایک روشنی نظر آئی۔ قریب پہنچے دو لمبی لمبی کاریں کھڑی تھیں جن کے شیشے ہماری موٹر کی روشنی سے چمک رہے تھے۔ سامنے ایک چھوٹا سا مکان تھا ——— میں نے دروازہ کھٹکھٹایا آوازیں دیں، کواڑ کھلے اور ایک گول مٹول چہرہ نظر آیا۔ جلتی ہوئی موم بتی ہوا سے بجھ گئی۔ اسے دوبارہ روشن کیا گیا تو دھیمی سی روشنی میں چند اور چہرے دکھائی دیئے ——— جس نے دروازہ کھولا تھا وہ اور اس کے دو ساتھی قالین پر بوتلیں بھائے بیٹھے تھے، میں ایک طرف بیٹھ گیا۔

وہ تینوں تقریباً ایک سے تھے، پستہ قد، پھولے ہوئے جسم، موٹے موٹے نقش، چہروں سے گوشت کے لوتھڑے لٹک رہے تھے۔ ڈرائیور نے مجھے بکس اور تھیلا دے دیا اور خود موٹر میں سو گیا، جب آندھی تیز ہوتی تو ان کی باتیں ہوا کی سیٹیوں اور چیخوں میں گم ہو جاتیں ——— اس عجیب سے ماحول میں وہ غولِ بیابانی معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے بہت سارا کھانا نکالا میری طرف دیکھا میں نے نفی میں سر ہلا دیا اور چار کی تھرماس کھول لی۔

ایک ڈیڑھ گھنٹے میں کھانا ختم ہوا تو بوتلیں کھول کر باتیں شروع کر دیں ——— وہ بڑی جلدی جلدی بولتے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے کچھ آندھی کا شور، میں ان کی گفتگو اچھی طرح نہ سمجھ سکا لیکن بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک جو اپنے بھتیجے کا واحد نگراں تھا بتا رہا تھا کہ لڑکے کا لاکھوں کا بیمہ کرایا جا چکا ہے، اسے دانستہ طور پر خطرناک کام دیئے جاتے ہیں، پرخطر جگہوں پر بھیجا جاتا ہے لیکن ابھی تک کچھ نہیں ہوا۔ تھوڑے سے انتظار کے بعد لڑکے سے مجبوراً وہی سلوک کرنا پڑے گا۔ جو دو بچوں سے کیا جا چکا ہے ——— یہ کہہ کر وہ زور سے ہنستا۔

دوسرے نے یتیم خانوں اور ایسے دیگر منافع بخش اداروں کا ذکر کیا۔ پھر دولت اور نام کے سلسلے میں امیر عورتوں کو ورغلانے کے پروگرام بیان کیے گئے ——— جعلی دستخطوں، جعلی دوستیوں اور بہت سی جعلی چیزوں کا ذکر ہوا ———

میں تھکا ہوا تھا دیوار کا سہارا لے کر اونگھنے لگا ——— پھر جیسے خراٹوں نے چونکا دیا آندھی کا شور ختم ہو چکا تھا۔ — دروازہ کھولا تو چاندنی اندر آ گئی۔ باہر سب کچھ ساکن تھا آسمان میں چاند چمک رہا تھا ———

چاندنی میں وہ تینوں دکھائی دیئے انکے منہ کھلے ہوئے تھے سانس لیتے تو توندیں پھول جاتیں، جب سانس باہر نکلتا تو بڑی بھیانک آواز آتی۔ یوں لگتا تھا جیسے تین مردہ جسم شدید عذاب میں مبتلا ہوں۔

باہر نکل کر دیکھا تو دُور دُور تک قبریں ہی قبریں تھیں، آندھی سے بچ کر جہاں پناہ لی تھی وہ اس قبرستان کی کوٹھری تھی۔ دفعتاً آنکھوں کے سامنے ایک اور نظارہ کوند گیا ———

محاذ پر ایک قبرستان بمباری کی زد میں آ گیا، دھماکوں کے ساتھ قبریں کھل گئیں مردے، دُور دُور جا پڑے، کچھ دیر کے بعد جگہ جگہ لاشیں نظر آنے لگیں کچھ ان کی تھیں جو ابھی ابھی مرے تھے کچھ پرانی تھیں، نئی پرانی لاشیں اور بے ہوش زخمی سب آپس میں الجھے ہوئے پڑے تھے۔

موت کیسے کیسے روپ بدل کر آتی ہے، کبھی پہلے بیماری بھیج کر جسم کو اچھی طرح بھسم کر لیتی ہے کبھی بے خبری میں آن دبوچتی ہے کبھی ایذائیں دے کر تڑپا تڑپا کر جان لیتی ہے لیکن سب سے ذلیل موت وہ ہے جو زندہ جسم میں یوں حلول کر جاتی ہے کہ سانس آتا رہتا ہے، حواس درست رہتے ہیں لیکن دل و دماغ مر جاتے ہیں، ضمیر مر جاتا ہے، انسان مر جاتا ہے۔ قبرستان کی یہ تین زندہ لاشیں بھی طبعی موت سے کہیں پہلے مر چکی تھیں۔

دور افق پر دھیلی لکیر کھینچی ہوئی تھی ——— یہ دجلہ تھا۔ میں اس کی طرف چلتا گیا حتیٰ کہ کنارہ آ گیا ——— دریا کی شفاف سطح پہ تارے ٹمٹما رہے تھے، پانی یوں ساکن تھا جیسے

لہروں اور گرداب سے نا آشنا ہو۔ ہلکی ہلکی دھند اٹھ رہی تھی، دوسرا کنارہ اوجھل ہو گیا چاند بے نور ہو کر چھپنے لگا۔ نظارہ سمٹتے سمٹتے محدود ہو گیا۔ میں ایک چھوٹے سے جزیرے میں رہ گیا۔

مشرق سے روشنی پھیل رہی تھی، خنک ہوا کے جھونکے آئے، طیور چہچہانے لگے ــــــ تخلیق تو روشنی، زندگی، رنگ و بو اور لطافتیں لے کر آئی تھی، انسان سے حسن پاکیزگی اور ہمدردی کی توقعات تھیں، دریا خشک ویرانوں کو سیراب کرنے کے لئے بہائے گئے تھے۔ پھر کیا ہوا ــــــ کہ صدیوں سے ان کا پانی کبھی انسان کے خون سے سرخ ہوا ہے، کبھی کتابوں کی سیاہی سے ہفتوں گدلا بہا ہے ــــــ ان کے کناروں نے ہریالی کی جگہ مایوس کن نظارے دیکھے ہیں۔

میں واپس پہنچا تو لمبی لمبی کاریں جا چکی تھیں، کوٹھی خالی تھی، ایک طرف کچھ چبائی ہوئی ہڈیاں پڑی تھیں اور ٹوٹی ہوئی بوتلیں۔ ڈرائیور میرا انتظار کر رہا تھا۔

بغداد میں سعدہ سے ملاقات ہوئی۔ اس کے گھر گیا، سعدہ نے سادے سے کپڑے پہنے ہوئے تھے، بال بکھرے ہوئے ننگے پاؤں، میک اپ کے بغیر اس حلئے میں وہ چھوٹی سی لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔

"سکول سے آئی ہو؟ تمہارا بستہ کہاں ہے؟؟"

وہ ہنسنے لگی ــــــ "میں تو اسی طرح رہتی ہوں آرائش سے مجھے نفرت ہے ان دنوں پارٹیوں کے لئے مجبوراً بننا سنورنا پڑتا تھا ــــــ"

میں نے منصور کا ذکر کیا ــــــ "وہ بھی چلا گیا ــــــ دوسرے بھی چلے گئے ــــــ کبھی کبھار خط لکھ دیتے ہیں بس!"

دوستوں کے متعلق پوچھا ــــــ اس نے بتایا کہ برٹن نے گریس سے شادی کر لی تھی جو اسے زبردستی اپنے ساتھ آسٹریلیا لے گئی۔ جب برٹن تندرست ہو کر ہسپتال سے نکلا تو خود اسے بھی علم نہ تھا کہ کیا ہو گیا ہے، مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔ اس کا جوان بھتیجا قاہرہ سے شریک ہونے آیا تو گریس نے مغالطے میں اسی کو دولہا سمجھا۔ جرجیس بڑے مزے میں ہے۔

کام پر جا رہا تھا کہ موٹر الٹ گئی جس نے ترس کھا کر تیمارداری کی وہ بڑے مالدار شخص کی اکلوتی لڑکی نکلی، چنانچہ جبیں کو بیٹا بنا کر ساری دولت اور لڑکی اس کے حوالے کر دی گئی۔ روز نے ولایت میں بزنس شروع کی تھی بڑے فارمولے لگائے، ساری ریاضی صرف کر دی لیکن کچھ نہ ہوا اکثر جواب غلط نکلے۔ بزنس چھوڑ کر کسی سکول میں حساب پڑھاتا ہے ـــــ موہن کے حالات ویسے ہی ہیں کسی خط سے افسردگی ٹپکتی ہے تو کسی سے مسرت ـــــــ

"اور سلیم؟" ــــ میں نے پوچھا۔

سلیم لکھ رہی ہے ـــــ"

"اور تم ـــ ؟"

"سلیم منصور اور دوسرے اکثر مجھ سے جذباتی اور سنجیدہ قسم کی باتیں کیا کرتے ـــ لیکن میں جانتی تھی کہ ان جذبات کی تہہ میں تنہائی کارفرما ہے یا شراب کا نشہ ـــ تم بتاؤ کہ تمہارے ہونٹوں سے کبھی ایک لفظ بھی نہ نکلا ـــــــ"

"نہ میں تمہارا نہ نشے کی ضرورت محسوس ہوئی ـــــ"

"کون ہے وہ جس نے تمہاری قوتِ گویائی سلب کر رکھی ہے؟"

"کوئی بھی نہیں ـــ سچ مچ!"

"اب بھی کچھ سوچ رہے ہو ـــ کچھ تو کہو ـــــ"

"سوچ رہا ہوں کہ مشاہدے میں غلطی ہو جاتی ہے، کبھی فکر و عمل میں مطابقت نہیں رہتی اور نظریے بھٹکنے لگتے ہیں ـــــ" دیر تک خاموشی رہی۔ پھر میں نے اسے سلیم کے بارے میں چھیڑا ـــــــ

جس سے واقفیت رہ چکی ہو اسے کیا برا بھلا کہنا ـــ اندھیرے میں کبھی کبھی جگنو سے چمکتے تھے ایک چنگاری تو اس رات بجھی تھی جب تم لطیفہ کو کشتی میں لے گئے تھے ـــ"

"لطیفہ مجھے لے گئی تھی ـــ"

"اگلے روز مجھے سٹیشن پر چھوڑنے آئی ــــــ

"یاد ہے یہی پلیٹ فارم تھا یہی وقت تھا۔ تب تم نے جھوٹا وعدہ تک نہ کیا ـــ اب تم وطن جا رہے ہو ـــ"

ٹرین چلنے لگی ـــ "تمہیں بصرے سے خط لکھوں گا ـــ"

"تم نے دجلے کے کناروں سے خط نہ لکھا ـــ وہاں سے سمندر شروع ہو جاتا ہے ـــ"

بصرے میں دکان سے دو کارڈ لیے جن پر دجلے کی تصویر تھی، ایک پر موہن کا پتہ لکھا دوسرے پر منصور کا ـــ سوچنے لگا کہ اور کیا لکھوں۔

جہاز کی روانگی میں چند منٹ رہ گئے تھے آخر کارڈوں پر حکیم بقراط کا یہ فقرہ یاد آگیا ـــ

"زندگی مختصر ہے اور کام بہت زیادہ۔ مواقع تیزی سے گزرے جا رہے ہیں۔ تجربہ خام ہے اور صحیح نتیجے پر پہنچنا بہت مشکل ـــ"

احمد ندیم قاسمی

تین سرزمینیں

سرزمینِ دل پہ ماضی کے رواں ہیں کارواں
چار سو آراستہ ہیں کتنی یادوں کے نشاں

اک طرف چہرے، کتابوں کی طرح رازوں سے پُر
اک طرف تیور، تقاضے۔ اک طرف آنکھیں، زباں
اک طرف جلتے ہوئے ہونٹوں کی شمعیں شعلہ بار
اک طرف اُڑتا ہوا گیسوئے مشکیں کا دھواں
اک طرف صرف ایک جھپکی میں گزرتے ماہ و سن
اک طرف وہ پل، کہ غش کھا جائے عمرِ جاوداں
اک طرف ہے وسعتِ گیتی، مگر محصور ہے
اک طرف ہے حلقۂ آغوش، لیکن بیکراں
اک طرف دشمن کو بھی دشمن پہ پیار آیا ہوا
اک طرف نفرت کے نرغے میں خلوصِ دوستاں
اک طرف انسان خود اپنی نظر میں اجنبی
اک طرف ذرّوں کی مرّیخ و زحل سے شوخیاں

سرزمینِ حال پر ہے رخشِ مستقبل رواں
چار سو آراستہ ہیں کتنے خوابوں کے نشاں

اک طرف ویران رستوں پر جھجکتے ہمسفر
اک طرف ملبے کے ڈھیروں پر لچکتی کہکشاں
اک طرف افراد کے رشتوں میں آہنگِ نسیم
اک طرف قوموں کی باتوں میں گلوں کی نرمیاں
اک طرف تارے، عروجِ آدمی کے مستقر
اک طرف گھر کی منڈیروں پر حدودِ لامکاں
اک طرف حسن و محبت، اک طرف تقدیسِ خیر
اک طرف صرف آدمیت، اک طرف ہفت آسماں

سرزمینِ ذہن پر ہیں حال کے لشکر رواں
چار سو آراستہ ہیں کتنے زخموں کے نشاں

اک طرف امید کے پیڑوں پہ بور آیا ہوا
اک طرف گھرتی، امنڈتی، دندناتی آندھیاں
اک طرف ڈرتے عقیدے، اک طرف مرتے یقیں
اک طرف صف بستہ ابلیس، حقیقت میں گماں

سجاد ظہیر

ایسی بھی گھڑیاں آتی ہیں

ایسی بھی گھڑیاں آتی ہیں
جب سب شمعیں بجھ جاتی ہیں
تنہائی کے تہہ خانوں میں
مٹیالے اجگر رینگتے ہیں
لہو میں وِش گھُل جاتا ہے
دکھ اور پیڑا
لاچاری کے
ٹھنڈے، گاڑھے کہروں کی چادر میں
سب کچھ ڈھک جاتا ہے
کھو جاتا ہے!

انسانوں کی رنگین دنیا
آشاؤں کے جگمگ دیپک
رشتوں ناتوں کے جال
سبک چمکیلے
جن سے پیار بھرے، نمناک، رسیلے رویوں کی
ہونٹوں کی موہوم لکیروں
مدماتی آنکھوں کی
پرچھائیں جھلکتی ہے
لفظوں کے نگینے سو سو رنگ بدلتے ہیں
خلوت جلوت بن جاتی ہے
اور جان کو اک تازہ وعدہ
نورِ وزِ مسرت، ثروتِ دل کا مل جاتا ہے

تلخابِ ہلاکت ان سب کو
برباد و زبوں کر دیتا ہے
اور صرف ہیولے وحشت کے
ویران دلوں کے صحرا میں
چنگھاڑتے ہیں اور ناچتے ہیں

آزار خلل اور نیستی کی
یہ ناگ پھنی بھی زندہ ہے
اس میں بھی وہ ذرّے پنہاں ہیں
طاقت کا جن میں خزانہ ہے
حرکت کا جن میں دریا ہے
تنہائیاں سب مٹ جاتی ہیں
دستِ محنت جب ملتے ہیں
یا دو دل دھیرے دھیرے ہی
پر ایک ہی گت پہ دھڑکتے ہیں
اور ذہن کی لوح پہ عرفانِ آدم کے نقش
ابھرتے ہیں

تاروں کی برات نکلتی ہے
اور سب شمعیں جل اٹھتی ہیں

مخدوم محی الدین

دھنک

خواہشیں
لال، پیلی، ہری چادریں اوڑھ کر
تھرتھراتی، تھرکتی ہوئی جاگ اٹھیں
جاگ اٹھی دل کی اندر سبھا
دل کی نیلم پری جاگ اٹھی
دل کی پکھراج
لیتی ہے انگڑائیاں جام میں
جام میں تیرے ماتھے کا سایہ گرا
گھل گیا
چاندنی گھل گئی
تیرے ہونٹوں کی لالی
تری نرمیاں گھل گئیں
رات کی ان کہی، ان سنی داستاں
گھل گئی جام میں
خواہشیں
لال، پیلی، ہری چادریں اوڑھ کر
تھرتھراتی، تھرکتی ہوئی جاگ اٹھیں

مصطفیٰ زیدی

دوری

پہلے تیری محبتیں چُن کر
آرزو کے محل سجاتے تھے
بے نیازانہ زیست کرتے تھے
صرف تجھ کو گلے لگاتے تھے

زندگی کی متاعِ غم کو فقط
تیری آواز لُوٹ جاتی تھی
تیرے ہونٹوں کی لے اُبھرتے ہی
زخم کی تان ٹوٹ جاتی تھی

تو کنول تھی، ایاغ تھی، کیا تھی
روشنی کا سراغ تھی، کیا تھی
میرا دل تھی، دماغ تھی، کیا تھی
ساری دُنیا چراغ تھی، کیا تھی

اور اب یا شراب پیتے ہیں
یا فلک کو دعائیں دیتے ہیں
تیرے خاوند کی معیت میں
دور سے تجھ کو دیکھ لیتے ہیں

ڈاکٹر وزیر آغا

جنگل

بُگڑے پیڑوں کے جنگل میں
پتوں کی کالی دیواریں
دیواروں میں لاکھوں روزن
روزن — آنکھیں میں جنگل کی!
وحشی آنکھیں ہیں جنگل کی!!

تو راہی انجان مسافر
جنگل کا آغاز نہ آخر
سب رستے ناپید ہیں اسکے
سب راہیں مسدود سراسر

تو راہی — تہذیب کا پیکر
ہار چکا، جنگل سے لڑ کر!
اب آنسو کا دیا جلائے
تو گم کردہ راہ مسافر
ایسی پاگل نظروں سے کیوں
اوجِ فلک کی پیشانی پر
جھل مِل کرتے اُس جھومر کو
گھور رہا ہے؟؟

مسعود حسین

ایک کہانی

رات، کل فضاؤں میں، تیری ہی کہانی تھی
ہم ہی سننے والے تھے، دل کی پاسبانی تھی
آسماں سے آمد تھی، گم شدہ خیالوں کی
جس قدر تصور تھا، اتنی شادمانی تھی
دور ساری دنیا سے، اک نگر بسایا تھا
اسکا ایک راجہ تھا، اسکی ایک رانی تھی
زلف و رُخ کی باتیں تھیں، کیا دن کیسی راتیں تھیں
صبح کتنی رنگیں تھی، شام کیا سہانی تھی
یاد ہیں وہ دن ابتک جب حسین راتوں میں
تیری گنگناہٹ پر، میری نغمہ خوانی تھی
تیرے ایک تبسم پر وقت بھی ٹھہر جاتا!
اسمیں کب ترنم تھا، اس میں کب روانی تھی
آنسوؤں سے جیتا تھا، گوہر محبت کو
تیری کامرانی بھی کیسی کامرانی تھی
کتنی گرم جوشی تھی، کتنی گریہ وزاری
کتنی سرد مہری تھی، کتنی سرگرانی تھی!
یہ مری خدائی تھی یا تری، خدا جانے
میری لن ترانی پر تیری بے زبانی تھی!
میں نے تجھ کو کب سمجھا، میں نے تجھ کو کب پایا
میں زمیں کا بندہ، تو روح آسمانی تھی

مختار کریمی

سویرا

طویل ہونے لگے شام درد کے سائے
چلو ہم آجکی شب پھر انجمن بن جائیں
چلو پھر آج مضافاتِ شہر دلیں چلیں
افق کی سمت نگاہیں جمائیں راہ تکیں

غریبِ شہر، ہوس تاجرِ غمِ الفت
کوئی بھی روپ ہی راہرو تو آئیگا
کوئی تو اجنبی مہمان ایک شب کیلئے
ہمارے کلبۂ احزاں میں رک ہی جائیگا

کسے خبر کہ مسافر کے بھیس میں اس بار
کوئی خلیفۂ بغداد آ نکل جائے

بشر نواز

ازل تا ابد

اُفق تا اُفق یہ دھند لکے کا عالم
یہ حدِ نظر تک
نم آلودسی ریت کا نرم قالیں، کہ جس پر
سمندر کی چنچل جواں بیٹیوں نے کسی نقشِ پا کو بھی باقی نہ چھوڑا
فضا اپنے دامن میں بوجھل اُداسی سمیٹے ہے لیکن
مچلتی ہوئی مست لہروں کے ہونٹوں پہ نغمہ ہے رقصاں
یہ نغمہ سنا تھا
مجھے یاد آتا نہیں کب، مگر ہاں
بس احساس ہے اسقدر قرنہا قرن پہلے
کہ گننا بھی چاہے تو کوئی جنھیں گن نہ پائے
(بھلا سطحِ ساحل پہ پھیلے ہوئے ریت کے ننھے ذرّوں کو کوئی کہاں تک گِنے گا)
مچلتی ہوئی مست لہروں کو آغوشِ ساحل کے چھٹنے کا غم بھی نہیں ہے
وداعِ سکوں جیسے کوئی ستم بھی نہیں ہے
وداعِ سکوں تو ہے خود ایک نغمہ
جسے قرنہا قرن پہلے بھی مَیں نے سنا تھا
جسے لوگ سورج کے بجھنے تلک یونہی سنتے رہیں گے۔

قمر ہاشمی

فکر کی چاندنی

تم ہو جس دور کی شاعرہ
میں اسی عہد کا ایک فن کار ہوں
تم نے جذبات کی لَے میں
خود اپنے احساس کے تار چھیڑے ہیں
اور نغمہ و حسن کی چاندنی اپنے فن میں سمیٹی ہے
میں آگہی کے جھلستے ہوئے مہر کی تیز کرنوں سے
آئینۂ فن کو مجروح کرتا رہا
تم نے محبوب کے واسطے آسماں کے تاروں کو توڑا ہے
میں آدمی کے لئے ڈالیاں کہکشاں کی جھکاتا رہا
تم نے عشرت کدوں کی کہانی لکھی
اور میں خاک بر سر زمینوں پہ دھومیں مچاتا رہا
تم نے پھولوں کی سیجوں پہ نظمیں لکھیں
اور میں زخم کے پھول چنتا رہا
زندگی، چاندنی، پھول، شبنم کی خاطر
جہنم کے شعلوں کا پندار بھی توڑ سکتے ہیں ہم
آؤ! ادراک کی روشنی لے کے بڑھتے رہیں
اس سے پہلے کہ ہم
رقص گاہوں کو شادابیٔ جسم و جاں بخش دیں
علم کی بارگاہوں کو روشن کریں

دانش فرازی

شاہکار

فسونِ طرازیٔ محبوبِ خوش ادا کی قسم

کمالِ حسنِ غزالاں بھی ہم نے دیکھا ہے
فروغِ سرو چراغاں بھی ہم نے دیکھا ہے
جمالِ ماہِ درخشاں بھی ہم نے دیکھا ہے
مگر یہ شرط ہے اُس ماہ وش کی آب کہاں
کہ خالِ عارضِ گلرنگ کا جواب کہاں

اُسے نشاطِ سحر، نزہتِ چمن کہیے
بہار کہیے، شبِ ماہ کی پھبن کہیے
گلوں کی آن، ستاروں کا بانکپن کہیے
وہی ہے نقشِ سویدائے خاطرِ عالم
وہی گہر ہے، وہی کہکشاں، وہی شبنم

لپکتے، جھومتے سرشار آبشاروں میں
سرودِ نے میں، ہوا کے لطیف دھاروں میں
نگاہِ وقت کے وجد آفریں اشاروں میں
سُنی ہے گوشِ سخنور نے گفتگو اُس کی
اُفق اُفق کے ہے سینے میں آرزو اُسکی

بغیر اُس کے یہ افسانۂ گلو کیا ہے
حدیثِ رقص و بیانِ مے و سبو کیا ہے
یہ لذتِ خلشِ تیغِ آرزو کیا ہے
جو وہ نہیں تو یہ تعمیرِ مدعا کیسی
ہمارے آئینۂ فکر میں جلا کیسی

زہے نصیب وہ قاتل بھی جاں نواز بھی ہے
فروغِ بزم و چراغِ حریمِ ناز بھی ہے
دیارِ شوق کا محمود بھی ایاز بھی ہے
حلاوتِ نگہ و سحرِ فن بھی رکھتا ہے
لٹے متاعِ سکوں، وہ چلن بھی رکھتا ہے

اُسی کے لب کو لبِ گل فروش کہتے ہیں
اُسی کے حسن کو محشر بدوش کہتے ہیں
اُسی کو رہزنِ تمکین و ہوش کہتے ہیں
وہ برقِ شعلہ فشاں ہے، وہ موجِ شبنم ہے
جمال و جبر کا اک دلنواز سنگم ہے

سوزِ تخلیق

سوزِ تخلیق ہے اک مرگِ مسلسل اے دوست
زندگانی کی بھی تکمیل ہے فن کی تکمیل
زہر کی طرح سے فن ہوتا ہے خوں میں تحلیل
جب کہیں ہوتا ہے فن پارہ مکمل اے دوست
قسمتِ کرمکِ بےچارہ ہے زندانِ حریر
تارِ ریشم سے کٹا رشتۂ انفاسِ حیات
کربِ تخلیق نے دی موت کے ہاتھوں سے نجات
مرگِ فن کار سے وابستہ ہے فن کی تقدیر
شمع بجھتی ہے تو شمعیں کئی جل اٹھتی ہیں
فن کو دیتا ہے جنم یوں کسی فنکار کا خواب
تارِ ریشم نظر آتا ہے حریر و سنجاب
راستہ ہو تو کئی راہیں نکل آتی ہیں
کرمِ ریشم ہو کہ ہو کرمکِ شبتاب کوئی
راس فن کار کو آیا تو نہیں خواب کوئی

دردِ رائیگاں

کیوں سرِ شام چراغوں کی لویں مدھم ہیں
پیڑ چپ چاپ ہیں ٹوٹے ہوئے خوابوں کی طرح
عرصۂ زیست سرابوں کی طرح

گھر کا دروازہ کھلا رہنے دو شاید کوئی آئے
کوئی مہتاب! کوئی پارۂ ابرِ سیمیں
کوئی تارہ، کوئی شعلہ، کوئی جگنو ہی سہی
دشتِ بے آب کا بھٹکا ہوا آہو ہی سہی
یادِ محبوب میں ٹپکا ہوا آنسو ہی سہی
(ہائے یہ سلسلۂ کشمکشِ وہم و یقیں)
سر و سامان پڑا رہنے دو شاید کوئی آئے

کوئی غارت گرِ دامن ہی سہی
کوئی رہزن ہی سہی

تحسین سروری

خواب آویزاں

اب بھی یادوں کے خزاں دیدہ چمن میں اکثر
آرزوؤں کا کوئی غنچہ چٹک جاتا ہے
کسی کھوئی ہوئی آواز، کسی آہٹ پر
شب کے سناٹے میں دل اب بھی دھڑک جاتا ہے
شہر سے دور، بہت دور کسی صحرا میں
کوئی ذرہ، کوئی مہتاب چمک جاتا ہے
اسکی کچھ دل کو خبر ہو کہ نہ ہو، چپکے سے
کوئی آنسو مژہ نم سے ڈھلک جاتا ہے
اب بھی رہوارِ خرد منزلِ آساں کے قریب
کسی مجنوں کی طرح راہ بھٹک جاتا ہے

کوئی موسم ہو، کوئی وقت ہو، اب بھی تحسین
کوئی پیمانہ، کوئی جام چھلک جاتا ہے

سہیل اختر

دور کی آواز

جی میں آتا ہے تجھے میں چیخ کر آواز دوں
پھر خیال آتا ہے تو نے سن کے یہ آوازِ درد
برہمی محسوس کی گر اپنی بزمِ عیش میں
اور پھر جھنجھلا کے، ماتھے پر شکن لاتے ہوئے
بند کر ڈالے در و روزن مری آواز پر!
اک بھٹکتی روح کی مانند یہ آوازِ درد
جانے کب تک بے بسی کی وادیٔ تاریک میں
یاس کے مرگھٹ پہ یونہی چیختی پھرتی رہے
جی میں آتا ہے تجھے میں زور سے آواز دوں
گھٹ کے رہ جاتی ہے یہ حسرت مرے دل میں مگر
سوچتا ہوں میں کہ میرے دل کی آوازِ نحیف
بار بھی پا جائے تیری بزمگاہِ عیش میں
اور اس محفل کے نغمہ ہائے طاؤس و رباب
سن بھی لیں غم کی سسکتی آہ کو، فریاد کو
شورِ نغمہ میں مگر دل کی یہ آوازِ نحیف
چند لمحوں میں سسک کر اسطرح دب جائیگی
جیسے پربت کے کسی پُرشور جھرنے پر ہوا
سرسراتی ہے مگر دم توڑ کر رہ جائے ہے

روشن صدیقی

(نذرِ غالب)

شوخیٔ تغافل میں، لطفِ برملا پایا
لطفِ برملا کیا ہے، اس سے کچھ سوا پایا
کیفِ زندگی یوں بھی کم نہ تھا مگر اے دوست
زہرِ غم کے ملنے سے اور ہی مزا پایا
کچھ کہا کرے کوئی، ہم نے ان بتوں کو بھی
روشناسِ غم دیکھا، درد آشنا پایا
نالۂ شبانہ کیا، آہِ صبح گاہی کیا
ہم نشیں جسے دیکھا اس کو نارسا پایا
ہم تو بے خبر ٹھہرے تو ہی کچھ بتا ناصح
اہلِ عقل و دانش سے زندگی نے کیا پایا
عمر بھر کی کھوئی نیند کاش آج لوٹ آئے
رنگِ خلوتِ جاناں تجھ میں اے صبا پایا
آج کتنے سینوں میں دل نہیں ہیں پتھر ہیں
خوش نصیب ہے جس نے دل برا بھلا پایا
کس سے اے روشن سیکھی تو نے یہ کم آمیزی
انجمن میں بھی تجھ کو خلوت آشنا پایا

شفقت کاظمی

○

چلتے ہی رہے ترے سہارے
ہم دشتِ وفا میں جی نہ ہارے
وہ یار، وہ آشنا ہمارے
معلوم نہیں کہاں سدھارے
اے وائے وہ روز زندگی کے
ہم نے ترے بعد جو گزارے
آئے نہ مگر فریب میں ہم
دنیا نے کئے بہت اشارے
رو دھو کے یہ سال بھی گذارا
اب کے بھی پھرے نہ دن ہمارے
وہ ہم سے ملے تھے دو گھڑی کو
جی بھر کے نہ ہو سکے نظارے
تکلیفِ کرم نہ کر کہ یوں بھی
راضی ہیں ترے ستم کے مارے
کچھ ہم بھی کھنچے کھنچے تھے شفقت
کچھ وہ بھی نہ ہو سکے ہمارے

بل کرشن اشک

اشک کو خود پہ ناز تھا کتنا، تم نے بھی دیکھا ہوگا
جس نے اُسے بے حال کیا ہے وہ چہرہ کیسا ہوگا
یارو، اُس کوچے کے گھر گھر میں نور جہاں ہے، جو بھی ہے
کھڑے رہو امید لگائے اک تو دریچہ وا ہوگا
حُسن اور عشق جسے ملتا ہے کچھ کھو کر ہی ملتا ہے
وینس کے بھی ہاتھ نہ ہونگے، کیوپڈ بھی اندھا ہوگا
اُنکی گلی سے اپنی گلی تک ہائے یہ میری خوش فہمی
کس نے مجھے پہچانا ہوگا، کس نے مجھے دیکھا ہوگا
سسکی کی آوازیں کل شب کہیں پاس سے آتی رہیں
جانے کس دکھیا کا سرہانہ اشکوں سے بھیگا ہوگا
اُنکے گھر شہنائی بجی ہے، ہون کُنڈ کے شعلوں میں
خوشبو ہی کیا جلتی ہوگی اک دل بھی جلتا ہوگا
کوچۂ دل میں سب یکساں ہیں، شاہ و گدا کی شرط نہیں
عشق کے اس بدنام نگر میں جو ہوگا رسوا ہوگا
شہر کے باہر دُنیا سے چھپ چھپ کے ملنے والو
اتنے لمبے چوڑے شہر میں کس کس سے پردا ہوگا
بُرا کیا جو اشک کے آگے یارو اُسکا نام لیا
گھنٹوں ہی تنہائی میں بیٹھا بے چارہ رویا ہوگا

وحید اختر

خوشبو ہے کبھی، گُل ہے کبھی، شمع کبھی ہے
وہ آتشِ سیال جو سینے میں بھری ہے

بادہ طلبی شوق کی دریوزہ گری ہے
صد شکر کہ تقدیر ہی یاں تشنہ لبی ہے

غنچوں کے چٹکنے کا سماں دل میں ابھی ہے
ملتے ہیں جو اٹھ اٹھ کے نظر اُن کی جھکی ہے

اب ضبط سے کہہ دے کہ یہ رخصت کی گھڑی ہے

اے وحشتِ غم دیر سے کیا سوچ رہی ہے
معصوم ہے یاد اُن کی بھٹک جائے نہ رستہ

خوں گشتہ تمناؤں کی کیوں بھیڑ لگی ہے
ہر رنگ سے، ہر رُخ سے جسے دل میں اُتارا

وہ شکل بھی اب خواب فراموش ہوئی ہے
ٹھہری ہے تو اک چہرے پہ ٹھہری ہی رہی ہے
بھٹکی ہے تو پھر آنکھ بھٹکتی ہی گئی ہے

شہرت بخاری

کرم ہو یا ستم، سمجھا نہ جائے
سوئے منزل کوئی رستہ نہ جائے

تمیز شہر و صحرا اُٹھ گئی ہے
کہاں ٹھہرے، کدھر دیوانہ جائے

یہ کیسا ابر ہے جس سے کہیں بھی
سمندر کے سوا برسا نہ جائے

قیامت ہے تری آواز پر بھی
دلِ بے تاب سے دھڑکا نہ جائے

گھُٹا جاتا ہے گو اس بھیڑ میں دم
مگر اس بھیڑ کو چھوڑا نہ جائے

ترانہ ہو، غزل ہو، داستاں ہو
ترے بیمار سے بہلا نہ جائے

نقاب آہستہ آہستہ اُٹھانا
دل اک دیوانہ ہے گھبرا نہ جائے

کسی دیوار کے سائے میں شہرتؔ
شکستہ پا ہوں پر ٹھہرا نہ جائے

رضیہ فصیح احمد

○

عشق پہ صدیاں بیت چکی ہیں عاشق آج بھی ہوتے ہیں
صحرا صحرا پھرنے والے اب گلیوں میں روتے ہیں
غیر کمندیں پھینک رہے ہیں تاروں پر سیاروں پر
"چندا ماموں دور کے" کہہ کر ہم آرام سے سوتے ہیں
اُن کی خاطر سب کچھ کھو کر پایا ہم نے ایک جواب
"آدرشوں پر مرنے والے اور بہت کچھ کھوتے ہیں"
دار و رسن کے سارے فسانے کس نے کہا اب کہنہ ہیں
دار و رسن پر مرنے والے آج بھی پیدا ہوتے ہیں
آزادی کا من و سلویٰ جیب میں ڈالے کون پھرے
ہم نے طوق گلے میں ڈالا آج کسی کے ہوتے ہیں
غزلیں کہنا نظمیں لکھنا اتنا آساں کام نہیں
ہم نے سنا ہے سچے شاعر جان سے ہاتھ بھی دھوتے ہیں
دل کی لگی نے ہم کو رضیہ یہ دو رنگی بخشی ہے
محفل محفل ہنستے ہیں اور کونے کونے روتے ہیں

اختر انصاری اکبرآبادی

○

چارہ سازو کچھ اور مرہم لاؤ
دلِ انساں میں ہیں ہزاروں گھاؤ
جوشِ طوفاں سے ہمیں ٹکراؤ
ہر تلاطم پہ کوئی گیت سناؤ
گرمیِ ظلم توڑتی ہے دم
جل چکے خشک ہڈیوں کے الاؤ
یہ چٹانیں پگھل ہی جائیں گی
منزل آتی ہے تم قدم تو بڑھاؤ
بندگی کا وقار کچھ تو رکھو
سر خداؤں کے سامنے نہ جھکاؤ
پھر جلانا چراغ اوروں کے
اپنے گھر کی تو پہلے آگ جلاؤ
موت خود منہ چھپائے گی اختر
زندگی کے نئے ترانے گاؤ

صغیر احمد صوفی

○

رہے کیوں وقفِ غم، حسنِ پشیماں، ہم جو بیٹھے ہیں
سئیں گے پھر سے سب جیبِ گریباں، ہم جو بیٹھے ہیں
دعائے خیر کیوں مانگیں سبک سارانِ ساحل کی
بدل دینگے مزاجِ شورِ طوفاں، ہم جو بیٹھے ہیں
نہ ہو مایوس یوں تابندگیِ صبحِ خنداں سے
کہ تیرے واسطے شامِ غریباں، ہم جو بیٹھے ہیں
بکھرنے دو ابھی کچھ اور محرومی کے جھونکوں سے
پئے آرائشِ زلفِ پریشاں، ہم جو بیٹھے ہیں
اسیرانِ روایاتِ کہن یہ شورِ ماتم کیوں
پگھل جائے گی خود زنجیرِ زنداں، ہم جو بیٹھے ہیں
بدل جائینگے میخانے کے آدابِ کہن صوفی
دیارِ لکھنؤ میں میرِ رنداں، ہم جو بیٹھے ہیں

حامد بہکاوی

○

کوئی ہمدم ہے نہ کوئی چارہ گر
کام آجائے جو اپنے وقت پر!
رات کی تنہائیوں کے دوش پر
تیری یاد آئی ہے گیسو کھول کر
صورتیں رقصاں ہیں چشمِ شوق میں
نقش ابھرے ہیں در و دیوار پر
دل کی بستی میں سکوتِ شام ہے
اے خیالِ یار آہستہ گذر
اس اندھیرے پر شبِ غم کے نہ جا
اس سے وابستہ ہے تقدیرِ سحر
سرحدِ ادراک سے اکثر پرے
ہم نے دیکھا ہے خیالوں کا سفر
زندگی سے زندگی کا کام لے
زندگی سے موت کا سودا نہ کر
اس زمیں میں آسمانِ فکر سے
ہم بھی لائے ہیں ستارے توڑ کر
ہم اگر چاہیں تو حامدؔ کاٹ دیں
"پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر"

خاور بانکوٹی

امرت کے بدلے ہونٹوں تک زہر کا ساغر آیا ہے
پیاس کی شدت سے گھبرا کر ہم نے دھوکا کھایا ہے

پیار نے کتنی وسعت دیدی اک چھوٹی سی دنیا کو
دل نے تمھارے غم کی خاطر، سب کا غم اپنایا ہے

چڑھ کے سورج نور بہائے یا انگارے، کون کہے
پورب میں خوش رنگ شفق کا آنچل تو لہرایا ہے

جیون پتھ پر چلنے والو! کل یہ گھنیری چھاؤں کہاں
بیٹھ بھی جاؤ آج کسی نے زلفوں کو پھیلایا ہے

اس دنیا کی محفل میں کب کوئی ہمیں پہچان سکا
دیکھنے والوں کو ہم نے خود آئینہ دکھلایا ہے

حسرت ترمذی

گلشن ہے یا صحرا ہے
اپنا گھر پھر اپنا ہے
پینے والے جب تک ہیں
ساقی ہے، مے خانہ ہے
ہر منزل سے کچھ آگے
منزل اہلِ تمنا ہے
عشق نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہائے وہ دل، جو تنہا ہے
تیرا تبسم موجِ بہار
تیرا تکلم نغمہ ہے
حال ہمارا، ہم سے نہ پوچھ
ہم نے تجھے بھی دیکھا ہے
آؤ جئیں جینے کی طرح
جب تک ہم کو جینا ہے
حسرت کا افسانہ کیا
دنیا کا افسانہ ہے

شبنم رومانی

کالج ——— فارومین

یہ کالج ہے "ومین" کا لیکن یہاں — جدھر دیکھئے، لڑکیاں، لڑکیاں
یہ کالج کی زینت لب و زلف و قد — لب و زلف و قد المدد، المدد
یہ دل میں خدائی یہ سر میں خودی — یہ غزلوں کے اشعار کی گدگدی
یہ انگلش کے گھنٹے میں شیلے کا راگ — یہ سر میں سماجی بغاوت کی آگ
یہ اک شوقِ تحقیق رازِ حیات — یہ سائنس کے دلربا تجربات
یہ "کیمسٹری" شغل دن رات کا — یہ اک فارمولا ملاقات کا
یہ اک ارتھمیٹک کی موٹی کتاب — یہ دل کی نئی دھڑکنوں کا حساب
یہ پرکار پہلو میں چاندا لئے — یہ نیچی نظر کے نئے زاویے
یہ "تاریخ" کے دلربا واقعات — یہ کالج ہے بت خانۂ سومنات
یہ "جغرافیہ" دشت و کہسار کا — یہ نجمہ کی آنکھیں "ختن مارکہ"
یہ شہناز کا نفسیاتی بخار — "کہ ڈگری" پہ شادی کا ہے انحصار
یہ ناہید کو امتحاں کا گلہ — "معاشی" مصیبت کا یہ سلسلہ
یہ "لاجک" ہے یا مس زرینہ کی غپ — یہ برقع ہے یا حسن کا "این ولپ"

گزرتی ہے کالج میں ہنس کھیل کر
الٰہی اُسے اب کے پھر فیل کر

یہ غلط ہے کہ کوئی ایک دوا ہر مرض کیلئے مفید ہو سکتی ہے

لیکن یہ صحیح ہے کہ

روغن برق

بہت سے امراض کے لئے اکسیر ہے

روغن برق رجسٹرڈ

کی ایک شیشی گھر میں رہے تو آپ ان جسمانی امراض کا علاج خود کریں گے اور کسی ڈاکٹر کے محتاج نہ ہوں گے

درد سر، درد کمر، درد گردہ، چوٹ، موچ، ورم، زخم، خنازیر، لقوہ، ملیرا، رعشہ، تشنج عرق النسا، سینہ اور پسلی کا درد، ورم جگر، ورم طحال، ورم مسوڑہ، ورم خصیہ، بواسیر، طاعونی گلٹی، کان کا درد، آنکھ کا درد، سرخی چشم، نزلہ و زکام، لرزہ و بخار، بچوں کی کمزوری و لاغری، پسلی کا چلنا، معمولی پھوڑا یا پھنسی اور بچھو و بھڑ کے ڈنک کے لئے روغن برق اکسیر ہے۔ اس کی روزمرہ کی مالش اعصاب کو قوت بخشتی ہے۔ بچوں، بڈھوں، پہلوانوں اور کھلاڑیوں کیلئے بیحد مفید اور بےمثال ہے۔

قیمت فی شیشی ۱ تولہ ۶ آنہ، ۲½ تولہ ۱۲ آنہ، ۵ تولہ عہ، ۱۰ تولہ لعہ

May-Sept. 1962 Reg. No. A 1646 Re. 1/-

SHAHKAR

c/o

KITABISTAN : Publishers : Allahabad.